MAUL - 608

ایم.اے.اُردو

سمسٹر چہارم

MASTER OF ARTS (URDU)

FOURTH SEMESTER

رُباعی

RUBAI

جگت موہن لال رواں

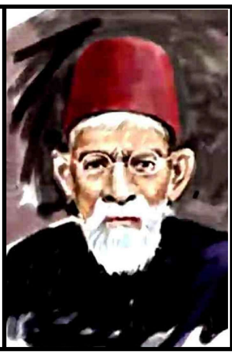

اکبرالہ آبادی

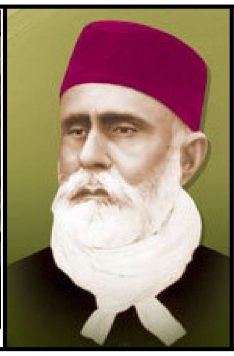

الطاف حسین حالی

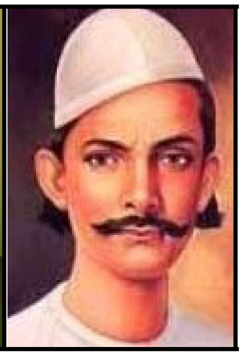

میرانیس

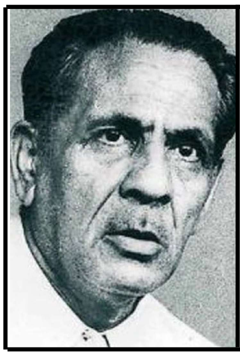

فراق گورکھ پوری

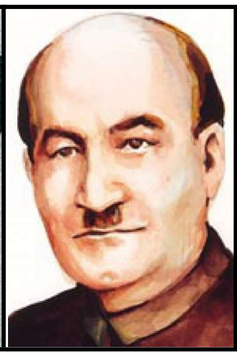

جوش ملیح آبادی

امجد حیدرآبادی

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

ایم.اے.اُردو

MASTER OF ARTS (URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل - ٦٠٨ - رباعی

MAUL - 608 - RUBAI

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

HALDWANI (NAINITAL) - 263139

سرپرستِ اعلیٰ:

پروفیسر او. پی. ایس. نیگی، وائس چانسلر، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کمیٹی بورڈ آف اِسٹڈیز:

پروفیسر رینو پرکاش، ڈائریکٹر اسکول آف ہیومنٹیز ،اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی (UOU)، ہلدوانی۔

پروفیسر توقیر احمد خاں، ریٹائرڈ پروفیسر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

پروفیسر سید محمد ارشد رضوی، گورنمنٹ رضا پی. جی. کالج، رام پور، اُتر پردیش۔

ڈاکٹر شہپر شریف، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

محمد افضل حسین، اسسٹنٹ پروفیسر و کورس کوآرڈِنیٹر شعبۂ اُردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

رجسٹرار:

کھیم راج بھٹ، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

کورس کوآرڈِنیٹر و ایڈیٹر:

محمد افضل حسین (اُستاد بریلوی)، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ اردو، اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی۔

© جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصّہ کسی بھی شکل میں یونی ورسٹی کی تحریری اجازت کے بغیر شائع نہ کیا جائے۔ یہ کتاب ''اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی'' کے ایم. اے. اُردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، رباعی کے نصاب کا جزو ہے۔ مزید معلومات کے لئے یونی ورسٹی حکام یا صدرِ شعبۂ اردو سے یونی ورسٹی کے حسبِ ذیل پتے یا ای-میل پر رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

ای-میل: ahusain@uou.ac.in (محمد افضل حسین)، sshareef@uou.ac.in (ڈاکٹر شہپر شریف)

DEPARTMENT OF URDU

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

UNIVERSITY ROAD, BEHIND TRANSPORT NAGAR (Teenpani Bypass)

HALDWANI-263139 Phone:05946-261122

MAUL – 608 - RUBAI

Board of Studies

Prof. Om Prakash Singh Negi
Vice Chancellor,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Renu Prakash
Director, School of Humanities,
Uttarkhand Open University, Haldwani

Prof. Tauqeer Ahmad Khan
Rtd. Professor, Department of Urdu
University of Delhi, New Delhi

Prof. Syed Mohammad Arshad Rizvi
Department of Urdu,
Govt. Raza Post Graduate College, Rampur

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Registrar

Shri Khemraj Bhatt
Uttarkhand Open University,
Teen Pani By-pass Road, Haldwani - 263139

Programme Coordinator

Mohammad Afzal Husain
Head, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Cover Page Design and Format Editing

Dr. Shahpar Shareef
Assistant Professor, Department of Urdu
Uttarkhand Open University, Haldwani

Unit Writers	Unit No.	Unit Writers	Unit No.
Dr. Shareef Ahmad Quraishi	**UNIT – 01**	**Dr. Sauban Sayeed**	**UNIT – 06**
Dr. Shareef Ahmad Quraishi	**UNIT - 02**	**Mohammad Afzal Husain**	**UNIT - 07**
Dr. Shareef Ahmad Quraishi	**UNIT - 03**	**Mohammad Afzal Husain**	**UNIT - 08**
Dr. Shareef Ahmad Quraishi	**UNIT - 04**	**Dr. Sauban Sayeed**	**UNIT - 09**
Dr. Shareef Ahmad Quraishi	**UNIT - 05**		

Editors

Mohammad Afzal Husain, Head, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Dr Shahpar Shareef, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Ghulam Jilani, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Mohammad Salim, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani
Shane Ali, Assistant Professor, Department of Urdu, Uttarkhand Open University, Haldwani

پیش لفظ

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا قیام اُتراکھنڈ قانون ساز اسمبلی کے ایک ایکٹ کے تحت ۳۱/ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو عمل میں آیا جس کا مقصد فاصلاتی نظامِ تعلیم کے ذریعے آبادی کے بڑے حصے کے ایسے اَفراد کی تعلیمی ضرورتوں کی تکمیل ہے جو کسی مصروفیت یا مجبوری کے سبب کالجوں یا یونی ورسٹیوں تک نہیں پہنچ پاتے ہیں۔ یونی ورسٹی کے تعلیمی پروگرام ''ماسٹر آف آرٹ'' کے تحت ''ایم.اے. اردو'' کو شامل کیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایم.اے. اردو سالِ دوم، سمسٹر چہارم، رباعی کے نصاب کا جزو ہے۔ یہ کتاب ۹/ اکائیوں پر مشتمل ہے جو الگ الگ موضوعات پر مختلف اسباق کی شکل میں ہیں۔

عزیز طلبا و طالبات!

فاصلاتی نظامِ تعلیم کی کتابوں کو {خود تدریسی مواد {SLM}(Self Learning Material) کہا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو یہ مواد خود ہی پڑھنا ہے۔ روایتی درس گاہوں کے برخلاف اِسے پڑھانے کے لئے آپ کے سامنے استاد موجود نہیں ہوگا۔ اِس صورتِ حال کے تحت اسباق کو اِس طرح تیار کیا گیا ہے کہ آپ کو کلاس میں اپنی اور استاد کی موجودگی کا احساس ہو سکے۔ اِسی لئے ہر اکائی کا آغاز ''اغراض و مقاصد'' سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کو اِس بات کا اندازہ ہو سکے کہ اکائی کو پڑھنے کا مقصد کیا ہے؟ اُس کے بعد ''تمہید'' دی گئی ہے جس میں سبق کو مختصر انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اکائی کے درمیان ''اپنے مطالعے کی جانچ کیجیے'' کے تحت کچھ سوالات بھی دِیے گئے ہیں تاکہ آپ نے جو کچھ پڑھا ہے، اُسے کس حد تک ذہن نشین کیا ہے؟ اِس بات کا بھی اندازہ لگایا جا سکے۔ کتاب کے آخر میں اُن سوالات کے جوابات بھی دِیے گئے ہیں لیکن آپ کو چاہیے کہ پہلے خود اُن سوالات کو حل کریں پھر آخر میں دِیے گئے جوابات سے اپنے جوابات ملالیں تاکہ آپ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ بھی ہو اور آپ کی ذہنی ورزش بھی ہو جائے۔ امتحان میں آپ سے جس طرح کے سوالات پوچھے جائیں گے اُس کے نمونے بھی دِیے گئے ہیں۔ ساتھ ہی ہر اکائی کے آخر میں مشکل الفاظ کی ''فرہنگ'' اور ''حوالہ جاتی کتب'' کی فہرست بھی دی گئی ہے تاکہ آپ اُن کتابوں کے مطالعے سے اپنی معلومات میں مزید اضافہ کر سکیں۔

ہم آپ کی کام یابی کے لئے دعائیں اور نیک خواہشات پیش کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

ایم.اے.اُردو

(M.A.URDU)

سالِ دوم

SECOND YEAR

سمسٹر چہارم

FOURTH SEMESTER

ایم.اے.یو.ایل - ۶۰۸ - رباعی

MAUL - 608, RUBAI

اکائی نمبر	مضمون	مضمون نگار	صفحہ
بلاک نمبر 01:			5
اکائی 1	رباعی : تعریف اور تاریخی ارتقا	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	6
اکائی 2	رباعی کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	24
اکائی 3	میر ببر علی انیسؔ (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	39
اکائی 4	خواجہ الطاف حُسین حالیؔ (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	57
اکائی 5	اکبر حُسین اکبرؔ الہ آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی	76
بلاک نمبر 02:			95
اکائی 6	سید احمد حسین امجدؔ حیدر آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر ثوبان سعید	96
اکائی 7	جگت موہن لال رواںؔ (بحیثیتِ رباعی گو)	محمد افضل حسین	112
اکائی 8	رگھو پتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری (بحیثیت رباعی گو)	محمد افضل حسین	129
اکائی 9	شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر ثوبان سعید	148

بلاک نمبر 01

اکائی	01	رباعی : تعریف اور تاریخی ارتقا	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی	02	رباعی کا فن	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی	03	میر ببر علی انیسؔ (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی	04	خواجہ الطاف حُسین حالؔی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی
اکائی	05	اکبر حُسین اکبرؔ الٰہ آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر شریف احمد قریشی

اکائی 01 رباعی : تعریف اور تاریخی ارتقا

ساخت

01.01 : اغراض ومقاصد

01.02 : تمہید

01.03 : رباعی کی تعریف

01.04 : اُردو رباعی کا تاریخی ارتقا

01.05 : اُردو کے رباعی گوشعرا

01.06 : خلاصہ

01.07 : فرہنگ

01.08 : سوالات

01.09 : حوالہ جاتی کتب

01.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو اُردو رباعی کی تعریف اور اُس کے تاریخی اِرتقا سے متعارف کرانا ہے۔ رباعی کے تاریخی اِرتقا کے ساتھ آپ کو رباعی کی بنیادی خصوصیات، رباعی کے موضوعات اور رباعی گوشعرا کے فن وفکر سے بھی اچھّی طرح واقف کرانا اس اکائی کا مقصد ہے۔ رباعی اُردو زبان کی ایک اہم صنف سخن ہے مگر طلبا وطالبات اور درس وتدریس سے وابستہ حضرات جس قدر غزل، نظم، مثنوی اور مرثیہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور پڑھتے پڑھاتے ہیں، اُس ذوق وشوق سے رباعی کی طرف متوجّہ نہیں ہوتے ہیں جب کہ زبان وبیان اور موضوعات کے اعتبار سے یہ صنف دیگر اصنافِ سخن سے کسی بھی طرح کم نہیں۔

رباعی کی بنیادی اور اہم خصوصیات کو سمجھے بغیر اُردو کے شعری سرمایہ کو اچھّی طرح نہیں سمجھا جاسکتا اس لئے رباعی کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ دراصل اس اکائی کا اہم مقصد آپ کی رباعی فہمی اور رباعی کے تئیں آپ کی دل چسپی میں اضافہ کرنا ہے۔

01.02 تمہید

شاعر اپنے خیالات، جذبات اور مشاہدات کو مختلف اصنافِ سخن کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے۔ آپ نے اُردو شاعری کی مختلف اصنافِ سخن کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا ہوگا۔ بعض اصنافِ سخن مقبولِ خاص وعام ہیں اور بعض اصنافِ سخن کتابوں اور شعرا یا اہلِ ذوق تک ہی محدود ہوکر رہ گئی ہیں۔ قصیدہ، مثنوی، مرثیہ، غزل اور رباعی مشہور ومقبول اصنافِ سخن ہیں۔

مرثیہ کو مختلف ہیئت میں نظم کیا جاسکتا ہے مگر قصیدہ، مثنوی، غزل اور رباعی کی اپنی ہیئت مخصوص ہیں۔ یہ دوسری ہیئت میں نظم نہیں کی جا سکتی ہیں۔ مندرجہ بالا تمام اصنافِ سخن میں رباعی گوئی ذرا مشکل فن ہے کیوں کہ اُس کی بحر مخصوص ہے جس پر طبع آزمائی کرنا ہر کس و نا کس کے بس کی بات نہیں۔ آپ اس اکائی میں رباعی کی تعریف، رباعی کے مختلف نام، رباعی کی ابتدا، رباعی کا تاریخی اِرتقا اور رباعی گو شعرا کی رباعیوں کی بنیادی خصوصیات کا بھی مطالعہ کریں گے۔ آپ کی رباعی فہمی کے اضافہ کے لئے فارسی زبان کے چند نام وَر شعرا کی رباعیوں کی خصوصیات کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔

01.03 رباعی کی تعریف

رباعی فنِ شعر کی ایک ہیئتی صنف سخن ہے جس میں صرف چار مصرعوں یعنی دو اشعار میں شاعر اپنا مطلب بیان کر دیتا ہے۔ دراصل یہ چار مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں رباعی اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس کے چار مصرعوں یعنی دو اشعار میں مکمّل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر تیسرے مصرعہ میں بھی قافیہ لایا جائے تو کوئی عیب نہیں۔ عموماً تیسرے مصرع میں قافیہ پیمائی کا رواج ختم سا ہوگیا ہے۔ رباعی عربی لفظ ''ربع'' سے مشتق ہے جو ''چار'' کے معنی کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ عَروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے متعدد نام ملتے ہیں۔ اس کا ابتدائی نام ترانہ ہے۔ ترانہ کے علاوہ اسے دوبیتی، چہار بیتی، چہار مصراعی بھی کہا جاتا تھا۔ کچھ عَروض داں نے اسے جفتی اور خصّی بھی کہا ہے۔ بہ لحاظِ قافیہ رباعی کی دو قسمیں ہیں، رباعی مصرّع اور رباعی خصّی یا ناقص۔

﴿ا﴾ **رباعی کے مختلف نام:** ابتدا میں رباعی کو ترانہ کیوں کہا جاتا تھا۔ اس کے متعلّق محققین اور ماہرینِ عروض کے خیالات مختلف ہیں۔ بعض محققین لفظ ''ترانہ'' کا ماخذ ''تر'' کو قرار دیتے ہیں اور بعض حضرات کا خیال ہے

کہ اس صنف کو ترانہ اس لئے کہا جاتا تھا کہ اربابِ موسیقی یعنی موسیقی کے ماہرین نے رباعی کے وزن پر بہترین اور دل کش راگ ایجاد کیے تھے۔ اسی طرح رباعی کو ''چہار بیتی'' اس لئے کہا جاتا تھا کہ موجودہ ہیئت کی رباعی کے وجود میں آنے سے قبل ایران میں ایک ایسا وزن رائج تھا جس کا ایک مصرع دو رکنی ہوتا تھا یعنی موجودہ رباعی کا چار رکنی مصرع قدیم وزن کے دو مصرعوں کے برابر ہوتا تھا۔ اس طرح موجودہ چار رکنی مصرعوں کے دو بیت اُس وقت چار بیت شمار کیے جاتے تھے۔ اسی قدیم وزن کی رعایت سے اُس وقت رباعی کو ''چہار بیتی'' کہا جانے لگا تھا۔ رباعی کو چہار بیتی اور چہار مصراعی کے بعد دوبیتی کہا جانے لگا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ بعد کے محققین، عروض داں اور شعرا نے اس کے دو مصرعوں کو بیت شمار کیا۔ اس لئے وہ اسے ''چہار بیتی'' کے بجائے ''دوبیتی'' کہنے لگے۔

شروع میں رباعی کے چاروں مصرعے باہم مقفّٰی یعنی ہم قافیہ ہوتے تھے جسے رباعی غیر خصّی یا رباعی مصرّع کہا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد تیسرے مصرع سے قافیہ حذف کر دیا گیا اور اُسے رباعی خصّی یا رباعی ناقص کہنے لگے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر رباعی کے چاروں مصرعے مقفّٰی یعنی ہم قافیہ ہوں تو اُسے غیر خصّی یا مصرّع رباعی کہیں گے۔ اگر پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعوں میں قافیہ ہو اور تیسرے مصرع میں قافیہ نہ ہو تو اُسے رباعی خصّی یا رباعی ناقص کہیں گے۔ ابتدائی دَور میں غیر خصّی رباعی کہنے کا رواج تھا لیکن رفتہ رفتہ خصّی رباعی کہنے کا چلن عام ہوتا گیا جو ایک عرصہ سے مقبولِ خاص و عام ہے۔ بعض عروض داں نے خصّی رباعی کو غیر مصرّع بھی کہا ہے۔

﴿۲﴾ ابتدائی دَور کی رباعیوں کے مقاصد: ابتدا میں رباعی کہنے کا مقصد عورتوں اور بچّوں کو خوش کرنا تھا۔ چوں کہ رباعی کا وزن موسیقی سے خاص مناسبت رکھتا ہے اس لئے رباعی کی ایجاد ہوتے ہی وہ مجلسوں اور محفلوں میں گا کر پڑھی جانے لگی۔ اس کی مقبولیت سے متاثر ہوکر بیش تر شعرا نے رباعیاں کہنا ضروری سمجھا۔ گا کر پڑھی جانے کے سبب عورتوں اور بچّوں نے اسے بہت پسند کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اپنے مشن کی تبلیغ کرنے اور اپنے خیالات کو مشتہر کرنے کی غرض سے صوفیائے کرام نے اسے اپنا لیا۔ تصوّف کے مسائل کے علاوہ رباعیوں میں حمد، نعت اور منقبت سے تعلّق رکھنے والے مضامین بھی نظم کیے جانے لگے۔ رفتہ رفتہ درباروں سے وابستہ شعرا بھی رباعی گوئی کی طرف متوجّہ ہوئے۔ وہ اس صنفِ سخن کے ذریعہ سلطانوں، بادشاہوں، نوّابوں، امیروں اور رئیسوں کے درباروں میں مطلب برآری کرنے لگے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ رباعی چار مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے جو بدیہہ گوئی کے لئے بہت موزوں ہے۔ اکثر بادشاہ، نوّاب اور امراء کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوکر درباری شاعر کو حکم دیتے تھے کہ وہ اس واقعہ کو فوراً نظم کرے۔ چوں کہ شاعر کے لئے حکم کی تعمیل لازمی ہوتی تھی اس لئے ایسے موقع پر رباعی اُس کے کام آتی تھی۔ وہ رباعی کی ہیئت میں اس واقعہ کو چار مصرعوں میں نظم کر کے سُنا دیتا تھا۔ اسی طرح بعض ہنگامی حالات میں بھی رباعیاں کہی جاتی تھی۔ تہنیت، شکوہ وشکایت، معذرت، طلب، احسان مندی وغیرہ کے اظہار کے لئے بھی رباعیوں سے خوب کام لیا جاتا تھا۔ کچھ شاہانِ مملکت کا شمار اپنے دَور کے نامور شعرا میں کیا جاتا تھا۔ چوں کہ اُن میں سے بیش تر سلاطین، نوّابین اور رؤساء عیش وعشرت، حُسن پرستی، عشق بازی اور عیّاشانہ رنگ رلیوں میں مبتلا رہتے تھے۔ اس لئے اُن کے یہاں عشقیہ رنگ کی رباعیات کی تعداد زیادہ ہے۔ اگر چہ اُنہوں نے حمد، نعت، منقبت تصوّف، شہدائے کربلا، محبتِ اہلِ بیت اور درسِ اخلاق کے موضوعات پر بھی رباعیاں کہی ہیں۔

﴿۳﴾ رباعی کی ابتدا: آپ نے ابھی تک رباعی کی تعریف، رباعی کے مختلف ناموں اور ابتدائی دَور کی رباعیوں کے مقاصد کا مطالعہ کیا ہے۔ رباعی کی ابتدا کس طرح ہوئی یہ جاننا بھی بہت ضروری ہے۔ تذکرہ نویسوں نے اپنے تذکروں میں رباعی کی ابتدا کے بارے میں جو واقعہ درج کیا ہے وہ نہایت دل چسپ اور حیرت انگیز ہے۔

بیش تر تذکرہ نویس رقم طراز ہیں کہ عید کے دن ایران کا امیر یعقوب بن لیث صفّار (المتوفی ۲۶۵ھ) اپنے دربار میں مسند نشین تھا۔ اُس کے مصاحبین بھی وہاں موجود تھے۔ دفعتہً اُس امیر کا خوردسال بیٹا اپنے ہاتھ میں کچھ جوز لیے ہوئے جوز بازی کے لئے محل سے نکلا۔ امیر زادہ کو دیکھ کر کچھ اور بچّے بھی وہاں جمع ہوگئے۔ وہ لوگ تھوڑی ہی دیر میں گوچی یعنی گڑھے میں جوز پھینکنے کا کھیل کھیلنے لگے۔ امیر یعقوب بھی اپنے مصاحبوں کے ساتھ کھڑے ہوکر بچّوں کی جوز بازی سے لطف اندوز ہونے لگا۔ بچّوں کے پاس آٹھ جوز تھے جنہیں وہ پھینک کر تمام جوز گڑھے کے اندر داخل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ امیر زادہ نے بھی کئی بار کوشش کی مگر ایک ساتھ آٹھوں جوز گڑھے میں داخل نہیں ہو سکے۔ تمام کوشش کے بعد ایک مرتبہ سات جوز گڑھے میں پہنچ گئے مگر ایک جوز باہر رہ گیا۔ یہ دیکھ کر امیر زادہ بہت افسردہ ہوا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے آٹھواں جوز بھی لُڑھک کر گڑھے میں چلا گیا۔ امیر زادہ کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ جوشِ مسرت میں بے اختیار ہوکر چلاّ اُٹھا۔

''غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو''

امیر یعقوب ان الفاظ کو سُن کر بہت محظوظ ہوا۔ اُس نے اپنے مصاحبوں سے کہا: مجھے اپنے بیٹے کا یہ کلام بہت پسند آیا ہے۔ مجھے یہ شعر کی کوئی قسم معلوم ہوتی ہے۔ آپ لوگ اس کلام کو جانچ پرکھ کر جلد بتائیں کہ یہ شعر کی کوئی قسم ہے یا نہیں؟

ابو ولف اور زینت الکعب اُس کی تحقیق اور تقطیع میں فوراً مشغول ہو گئے۔ دونوں نے مل کر اس کی تقطیع کی تو اسے ''بحر ہزج'' میں موضوع پایا۔ انہوں نے اُسی وقت اس مصرع کے ساتھ اُسی وزن کا ایک مصرع کہہ کر اسے ایک مصرع سے ایک شعر کر دیا۔ اُنہوں نے پھر تھوڑی دیر کے بعد اسی وزن کا ایک شعر اور کہہ کر دو بیت پورے کر دیے۔ دو بیتوں کی مناسبت سے اس نو ایجاد صنف سخن کا نام دو بیتی پڑ گیا اور رفتہ رفتہ یہی نام مشہور ہو گیا۔ عروض داں اور ماہرینِ فن نے اسے کئی نام دیے۔ آخر کار ایک مدّت کے بعد چار مصرعوں کے لحاظ سے اسے رباعی کہنے لگے جو آج تک رائج ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رباعی اہلِ عرب کی ایجاد ہے جب کہ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ عرب میں رباعی کہنے کا دستور نہیں تھا۔ دراصل رباعی خاص اہل عجم یعنی ایران کی ایجاد ہے۔ رباعی جس وزن میں کہی جاتی ہے عربی میں وہ وزن پہلے موجود ہی نہیں تھا۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ابو ولف کو ابو ولف عجلی تصور کر کے رباعی کی ایجاد کو مامون اور معتصم باللہ کے عہد سے جا ملایا ہے اور رباعی کو عربی الاصل ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابو ولف اور زینت الکعب جنہوں نے امیر یعقوب بن لیث صفّار کے بیٹے کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ ''غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو'' کی تقطیع کر کے کہا تھا کہ یہ مصرع ''بحر ہزج'' میں ہے، وہ عجمی یعنی ایرانی تھے نہ کہ عرب کے باشندے تھے۔

01.04 اُردو رباعی کا تاریخی ارتقا

شروع میں اُردو زبان عوام تک ہی محدود رہی۔ اُدَبا، شعرا، علما اور فضلا نے اس کی جانب کوئی خاص توجّہ نہیں کی۔ جب شاہانِ دکن اس زبان کو ترقّی دینے لگا تو اُدَبا اور شعرا بھی اس کی طرف متوجّہ ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس زبان میں فارسی زبان کے الفاظ بہت تھے، نمونہ کے لئے فارسی شعرا کا کلام بھی موجود تھا لہٰذا شاعروں کو زیادہ دقّتوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اُنہوں نے فارسی کی متعدد اصنافِ سخن کو اپنا لیا۔ یہی سبب ہے کہ اُردو میں ابتدا ہی سے قصیدوں، مثنویوں، غزلوں اور رباعیوں میں طبع آزمائی کی جانے لگی۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اُردو کی دیگر اصنافِ سخن جیسے مثنوی، قصیدہ، غزل وغیرہ کی طرح رباعی بھی فارسی کے ذریعہ اُردو میں داخل ہوئی۔ فارسی کے زیرِ اثر ہونے کے سبب ایک زمانہ تک اُردو شعرا نے اُردو رباعی کی طبع آزمائی کی طرف کوئی خاص توجّہ نہیں کی پھر بھی اُردو نظم کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو شاعری کے ابتدائی دَور میں بھی رباعیاں کہی جاتی تھیں۔

اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمّد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے کلّیات میں متعدد رباعیاں شامل ہیں۔ چوں کہ محمد قلی قطب شاہ سے پہلے اب تک کسی شاعر کا ایسا کلام دَست یاب نہیں ہوا جس میں رباعیاں بھی ہوں اس لئے اب تک کی تحقیق کے مدِّ نظر اُردو شاعری کے کسی باوا آدم کو اُردو رباعی کا بھی پہلا شاعر قرار دیا جانا چاہیے۔ محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں غزلیات، قصائد، مثنویات اور مراثی کے علاوہ متعدد رباعیاں بھی شامل ہیں۔ بعض محققین محمد قلی قطب شاہ کے ہم عصر مُلّا وجہی کو اُردو کا پہلا شاعر اور پہلا رباعی گو قرار دیتے ہیں۔ مُلّا وجہی ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں پیدا ہوئے تھے اور محمّد قلی قطب شاہ کے دربار سے اُن کا تعلّق تھا۔ اُنہوں نے محمّد قلی قطب شاہ کی مدح میں ایک مثنوی ''قطب مشتری'' نظم کی تھی۔ بعض محققین نے غلط فہمی کی بنا پر ۱۶۰۰ء سے پہلے کے ایک شاعر عبدالقادر حیدر آبادی کو اُردو کا پہلا رباعی

گوتسلیم کیا ہے۔ اگرچہ قدیم دکنی شعرا کی فہرست طویل ہے اور اُن میں سے بیش تَر شعرا نے مراثی، مثنویاں اور غزلیات پر طبع آزمائی کی ہے۔ غواصیؔ، نصرتیؔ، شاہیؔ، عبداللہ قطب شاہ، علی عادل شاہ ثانی، میراں، یعقوب وغیرہ کے یہاں رباعی کے ابتدائی نمونے پائے جاتے ہیں۔

دکن کے ایک رباعی گو شاعر سراجؔ اورنگ آبادی (۱۱۳۰ھ تا ۱۱۷۷ھ) ولیؔ کے ہم عصر تھے۔ اُنھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی اور دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ چند رباعیاں بھی کہی ہیں۔ دکن کے ایک مشہور و معروف غزل گو شاعر ولیؔ دکنی (۱۰۷۹ھ تا ۱۱۵۵ھ) کے دیوان میں قابلِ ذکر رباعیاں نظر آتی ہیں۔ شمالی ہند میں میرؔ اور سوداؔ کے عہد میں رباعی کے خدوخال اُبھرنا شروع ہو گئے تھے۔ دردؔ، میر تقی میرؔ، مرزا محمد رفیع سوداؔ، میر حسن اور اُن کے تلامذہ کے علاوہ دیگر غیر معروف ہم عصر شعرا نے بھی کم و بیش رباعیاں کہی ہیں۔ میر حسن نے سَو سے زائد رباعیاں کہی ہیں اور اُنھوں نے اپنے ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' میں بھی اپنی دو رباعیاں درج کی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اچھّے رباعی گو بھی تھے۔ اس عہد کے دیگر شعرا میں حسرتؔ دہلوی، بہادر علی حشمتؔ، عبدالحیٔ تاباںؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ چاند پوری، محمّد حُسین کلیم، احسن اللہ بیاںؔ، عزیزؔ بھکاری اور میر سوزؔ نے بھی رباعیوں میں طبع آزمائی کی ہے۔

عبدالحیٔ تاباںؔ اور احسن اللہ بیاںؔ کی رباعیات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ دیوانِ تاباں میں شامل تمام رباعیاں عشقیہ ہیں جن میں تغزّل اور سوز و گداز پایا جاتا ہے۔ احسن اللہ بیاںؔ کی بیش تر رباعیوں کی بھی یہی خصوصیات ہیں۔ قائمؔ چاند پوری شیخ ظہورالدّین حاتم المعروف بہ شاہ حاتمؔ کے شاگرد تھے۔ انہوں نے مذہب و اخلاق اور دیگر موضوعات پر متعدد رباعیاں کہی ہیں۔ اس عہد کے دہلوی شعرا کی رباعیات میں تصوّف کے مضامین کے ساتھ سنجیدہ اظہارِ بیان، سچّے جذبات اور پاکیزہ خیالات کو واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دردؔ کی رباعیوں کی تعداد تقریباً بتّیس ہے۔ اُن کی غزلوں کی طرح ان کی رباعیوں میں بھی رطب و یابس نظر نہیں آتا۔ اس دَور کے شعرا کے کلام کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بیش تَر شعرا نے رباعی گوئی کی طرف خاص توجّہ نہیں دی۔ وہ ضمنی طور پر رباعیاں کہہ لیا کرتے تھے۔

لکھنوی شعرا میں انشاء اللہ خاں اِنشاؔ، یحییٰ امان المعروف بہ قلندر بخش، جرأت وغیرہ کے یہاں بھی رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ ان شعرا کی رباعیاں دہلوی شعرا کی رباعیوں کے مقابلے میں بے مزہ اور بے کیف سی معلوم ہوتی ہیں۔ کلّیاتِ اِنشاؔ میں چالیس رباعیاں اور جرأت کے کلّیات میں ایک سَو بارہ رباعیات ہیں۔ اِنشاؔ نے مختلف موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں۔ اُنہیں ریختی میں بھی رباعیاں نظم کرنے میں مہارت حاصل تھی۔ اُن کی عشقیہ شاعری کی طرح اُن کی رباعیوں کے موضوعات بھی بالعموم عشق اور لوازمِ عشق تک ہی محدود ہیں۔ سطحی معاملہ بندی کے باوجود اُن کی رباعیاں سچّے جذبات کی ترجمان بھی ہیں۔ نظیرؔ اکبرآبادی نے بھی متعدد رباعیاں کہی ہیں۔ اُن کے مجموعۂ کلام میں بائیس رباعیاں پائی جاتی ہیں۔ اُن کی رباعیاں روزمرّہ کے اخلاقی درس اور پند و موعظت کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ اپنی بات کو سیدھے سادے اور دوٹوک پیرایے میں بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ نے بھی متعدد رباعیاں کہی ہیں مگر اُن کی رباعیاں اب تک دَست یاب نہیں ہوسکی ہیں مگر دو رباعیوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ یہ رباعیاں اُنہیں کی ہیں۔

اُردو شاعری کی ابتدا سے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے عہد تک رباعی کی طرف سنجیدگی کے ساتھ توجّہ نہیں دی گئی۔ اگرچہ اُردو شاعری کی ابتدا ہی سے رباعی کا وجود ملتا ہے۔ اُردو کا شاید ہی کوئی ایسا نام وَر شاعر ہو جس نے دو چار رباعیاں نہ کہی ہوں لیکن یہ بھی حقیقت ہیں کہ دکن اور شمالی ہندوستان میں کئی سَو سال تک رباعی کو وہ مقام حاصل نہیں ہوسکا جس کی وہ مستحق تھی۔ میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ، اُن کے ہم عصر اور پھر متاخرین

شعرا رباعی کی طرف سنجیدگی سے مائل ہوئے اور اُنہوں نے رباعی کو اس قدر فروغ دیا کہ دیگر مقبول اصنافِ سخن کی طرح رباعی کا شمار بھی باوقار صنفِ سخن میں کیا جانے لگا۔

میر ببر علی انیسؔ، مرزا سلامت علی دبیرؔ، مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، شیخ محمّد ابراہیم ذوقؔ وغیرہ نے غزلوں، قصائد اور مراثی کے علاوہ قابلِ قدر رباعیاں بھی نظم کی ہیں۔ اس دَور میں دہلی اور لکھنؤ دونوں ادبی مراکز میں رباعی کو بہت فروغ ہوا۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح رباعی کو بھی نہایت اہم اور قابلِ قدر صنف سخن کے درجہ تک پہنچا دیا۔ اس عہد میں لکھنؤ کے دیگر شعرا بھی انیسؔ اور دبیرؔ کی تقلید میں رباعی گوئی کی طرف متوجّہ ہوئے۔ انیسؔ نے تقریباً ساڑے پانچ سَو اور دبیرؔ نے تقریباً دوسَو رباعیاں کہی ہیں۔ انیسؔ اور دبیرؔ نے رباعی کو روایتی موضوعات کے دائرے سے نکال کر زندگی کی اخلاقی قدروں کا ترجمان بنا دیا۔

اگر چہ دہلی میں غالبؔ، مومنؔ، ذوقؔ، ظفرؔ اور شیفتہؔ جیسے با کمال شعرا موجود تھے لیکن مومنؔ کے علاوہ کوئی شاعر رباعی کی طرف سنجیدگی کے ساتھ متوجّہ نہیں ہوا۔ غالبؔ کے دیوان میں تقریباً پندرہ رباعیاں ہیں۔ غالبؔ رباعی کی طرف کبھی سنجیدگی سے متوجّہ نہیں ہوئے۔ اس لئے اُنہیں رباعی گوئی میں کوئی خاص مقام حاصل نہیں ہوسکا۔ ذوقؔ کی رباعیاں غالبؔ سے بہتر ہیں۔ مومنؔ نے تقریباً ایک سَو چالیس رباعیاں کہی ہیں۔ اگر چہ مومنؔ غزل اور قصائد میں غالبؔ اور ذوقؔ کے ہم پلّہ قرار نہیں دیے جاسکتے مگر رباعی میں اُنہیں ان دونوں اُستاذ الشعرا پر فوقیت حاصل ہے۔ غالبؔ کے شاگرد میر مہدی مجروحؔ نے بھی متعدد رباعیاں کہی ہیں۔ اُن کے دیوان میں کُل بتّیس رباعیاں ہیں جو اہلِ بیت کی مدح اور شہدائے کربلا کی یاد میں کہی گئی ہیں۔ اُن کی چند رباعیاں عشقیہ بھی ہیں۔

دَورِ جدید میں خواجہ الطاف حُسین حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی نے اخلاق اور اصلاحِ معاشرہ کو شاعرانہ انداز سے اپنی رباعیوں کا موضوع بنایا۔ دونوں کی رباعیوں کا لہجہ بڑی حد تک ناصحانہ ہے۔ ان دونوں شعرا نے زندگی کے متعدد اخلاقی پہلوؤں، تعمیری تجویزوں اور اصلاحی نکتوں کو اپنی رباعیات میں بیان کیا ہے۔ اسمٰعیل میرٹھی حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں اُن کے کلیات میں تقریباً چالیس رباعیاں ہیں جن کا انداز مصلحانہ ہے۔ اس عہد میں امیرؔ مینائی اور پیارے صاحب رشید نے بھی رباعیوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ پیارے صاحب رشید کا شمار ممتاز رباعی گو کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے بڑھاپے کے موضوع پر نہایت موثر اور قابلِ ذکر رباعیاں نظم کی ہیں۔ امیرؔ مینائی کی بیش تر رباعیاں نعتیہ ہیں۔ شادؔ عظیم آبادی نے غزلوں کے علاوہ رباعیاں بھی لکھی ہیں جن کی تعداد پچّانوے ہے۔ اُن کی بیش تر رباعیاں معرفت اور تصوف کی ترجمان ہیں۔ داغؔ دہلوی اور عزیزؔ لکھنوی نے بھی چند رباعیاں کہی ہیں۔

حالیؔ اور اکبرؔ الٰہ آبادی کے زیرِ اثر متعدد شعرا نے رباعی کی طرف کافی توجّہ مرکوز کی ہے اور بہت اچھّی اچھّی رباعیاں کہی ہیں جس کے سبب رباعی کو فروغ حاصل ہوا۔ شوکت علی خاں فانیؔ، امجدؔ حیدرآبادی، شاکرؔ میرٹھی، شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی، سیمابؔ اکبرآبادی، رگھو پتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری، تلوک چند محرومؔ، جگت موہن لال رواںؔ، علّامہ اقبالؔ، عبدالباری آسیؔ، یاس یگانہ چنگیزی وغیرہ کو رباعی گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ فانیؔ کی رباعیوں میں یاس انگیزی، حسرت خیزی، سوز وگداز اور درد وکرب کی بہتات ہے۔ سیمابؔ اکبرآبادی نے سیاسی، قومی اور مُلکی حالات پر متعدد رباعیاں نظم کی ہیں۔ محرومؔ کی رباعیاں انسانی جذبات اور حُسنِ فطرت کی نقّاشی کی آئینہ دار ہیں۔ رواںؔ کی رباعیوں میں وطنی شاعری اور قومی تصورات جا بجا نظر آتے ہیں۔ علّامہ اقبالؔ کی رباعیوں کی تعداد اگر چہ بہت نہیں ہے لیکن اُن کی بیش تر

رباعیاں قابلِ قدر اور قابلِ ذکر ضرور ہیں۔ جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھ پوری، محرومؔ اور رواںؔ کا شمار اس عہد کے ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ شاکرؔ میرٹھی بہترین رباعی گو شاعر تھے۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد رباعیاں کہی ہیں۔

جوشؔ کی رباعیاں وحدتِ خیال، زورِ بیان اور پُر شکوہ الفاظ کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ رندانہ جسارت کی وجہ سے فارسی کے رباعی گو شاعر عمر خیّامؔ سے متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ فراقؔ گورکھپوری کی رباعیوں کے مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ اُن کی رباعیاں قدیم ہند وثقافت ومعاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ وہ طبعاً جمال پرست اور رومان پسند تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شدید جمالیاتی احساس اور عمیق رومانی تفکّر کے سادہ پیکروں سے حُسن پُر کار کے رنگا رنگ پہلو پیدا کر لیتے ہیں۔ تلوک چند محرومؔ کی رباعیات کا مجموعہ ''رباعیاتِ محرومؔ'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ عبدالباری آسیؔ نے غزلوں کے علاوہ بہترین رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اُن کی رباعیوں کا ایک مجموعہ ۱۹۴۸ء میں شائع ہو چکا ہے جس میں تقریباً چھ سَو رباعیاں شامل ہیں۔ اُن کی بیش تر رباعیاں یاس وناامّید کی ترجمان ہیں۔ یاس یگانہ چنگیزی کے مجموعۂ کلام ''گنجینہ'' میں ایک سَو چونسٹھ رباعیاں شامل ہیں۔ اُن کی رباعیوں میں عشقیہ مضامین کے ساتھ تندی، تیزی اور ولولہ خیزی کو بھی واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

اثرؔ صہبائی نے بھی بہت سی رباعیاں کہی ہیں۔ اُن کی رباعیوں کے دو مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں جن کے نام ''جامِ صہبائی'' اور ''جامِ طہور'' ہیں۔ امجدؔ حیدرآبادی اس دَور کے ایسے رباعی گو شاعر ہیں جنھوں نے اس صنف سخن کی طرف خصوصی توجّہ دی۔ اُنھیں رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اُن کی تمام رباعیاں فنّی پختگی کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُنھوں نے رباعی کے وزن میں متعدد نظمیں بھی کہی ہیں جو ہر کس وناکس کی بس کی بات نہیں۔ خواجہ دل محمّد دلؔ، صفیہ شمیمؔ ملیح آبادی، حیدرؔ دہلوی، وحشتؔ کلکتوی، فارغؔ بخاری، پروفیسر سوزؔ، جگن ناتھ آزادؔ، اقبال حُسین شوقیؔ کا شمار بھی بہترین رباعی گو شعرا میں کیا جانا چاہیے۔ دورِ حاضر میں بھی بہت سے شعرا رباعیاں کہہ رہے ہیں جن میں سے بعض شعرا کی رباعیات کے مجموعے اور دواوین بھی زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

01.05 اُردو کے رباعی گو شعرا

اُردو نظم کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ اُردو شاعری کے ابتدائی دَور میں بھی رباعیاں کہی گئی ہیں۔ اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کے کلّیات میں کئی رباعیاں ہیں۔ چوں کہ اُن کی ساری زندگی عیش وعشرت، حُسن پرستی، عشق بازی اور عیّاشانہ رنگ رلیوں میں گزری تھی اس لئے غزلوں کی طرح اُن کی رباعیات میں بھی معاملاتِ حُسن وعشق، رنگ رلیوں اور سرمستیوں کی بہتات ہے۔ اگر چہ اُنھوں نے حمد، نعت، منقبت، تصوف، شہدائے کربلا، خمریات اور اخلاق کے موضوعات پر بھی رباعیاں کہی ہیں مگر اُن کی وہی رباعیاں اپنی طرف توجّہ مبذول کراتی ہیں جن میں وارداتِ حُسن وعشق کو نظم کیا گیا ہے۔ حُسن وعشق سے متعلّق اُن کی رباعیوں میں اصل زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ بطورِ نمونہ پیش ہے ایک رباعی:

تج حُسن تھے تازہ ہے سدا حُسن وجمال — تج یاد کی مستی اَہے عشق کوں حال
توں ایک ہے، تج سا نہیں دوجا کہیں — کیوں پاوے جگت صفحے میں کوئی تیرا مثال

مُلّا وجہی نثر اور نظم دونوں میں مہارت رکھتے تھے۔ اُن کا تعلّق محمّد قلی قطب شاہ کے دربار سے بھی تھا۔ اُن کی رباعیوں کو اُردو ادب کی رباعیوں کے قدیم ترین نمونوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ دکنی زبان میں کہی گئی اُن کی رباعیوں میں سلاست وروانی بھی ہے۔ یہاں اُن کی ایک رباعی درج کی جا رہی ہے:

خوش حال ہو جیو آج خوشی پاتا نئیں پیتا ہوں شراب ہَور اثر آتا نئیں
کانٹیاں کے ضرب دستے ہیں پھول سب تجھ باج سکھی باغ مجھے بھاتا نئیں

ابتدائی دَور کے ایک رباعی گو عبدالقادر حیدرآبادی کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اُن کا شمار منفرد رباعی گو کی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ اُن کی یہ رباعی بھی اپنے رنگ میں خوب ہے:

ہر چند ہمن سب سے اُٹھایا ہے ہات اس پر بھی نہ آزاد کہائے ہیہات
عالم ہنسے ، ہر ایک یہ کہتا ہوگا دکن میں ہے قادر ابھوں در قیدِ حیات

سراؔج اورنگ آبادی کی رباعیاں حُسن وعشق کی جلوہ سامانیوں اور رندانہ سرمستیوں کی حامل ہیں۔ اُنہوں نے عشقیہ جذبات کو نہایت سلیقے سے نظم کیا ہے مثلاً:

تھا عین نماز میں کہ ساقی آیا پھر ساغرِ مَے میرے مقابل لایا
مَیں اُس کوں اشارے میں کہا تائب ہوں بولا کہ شتاب پی ، پیا سو پایا

ولؔی دکنی کی رباعیات محبوب کی سراپا نگاری، جمال پرستی، عاشقانہ جاں سپاری اور عارفانہ جذبات کا بہترین نمونہ ہیں۔ اُنہوں نے چند رثائیہ رباعیاں بھی کہی ہیں مثلاً:

تجھ مُکھ کا ہے یُو پھول چمن کی زینت تجھ شمع کا شعلہ ہے اَگن کی زینت
فردوس میں نرگس نے اشارے سوں کہا یہ نور ہے عالم کے نَین کی زینت

دردؔ صوفی منش تھے۔ اُن کی طبیعت میں سوز وگداز فطری تھا۔ دردؔ کی عاشقانہ طبیعت نے تصوف کے خشک موضوع میں بھی دل کشی پیدا کر دی ہے۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کی ایک رباعی:

اے دردؔ یہ درد جی سے کھونا معلوم جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزارِ جہاں ہزاروں پھولے لیکن میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

میرؔ کی بیش تر رباعیاں خالص عشقیہ ہیں جن میں غزل کی سی شان اور سوز وگداز نمایاں ہیں۔ کچھ رباعیاں اخلاقی اور نصیحت آمیز ہیں اور بعض میں محض شاعرانہ تعلّی کا اظہار کیا گیا ہے، پیش ہے اُن کی ایک رباعی:

ہر صبح غموں میں شام کی ہے ہم نے خونابہ کشی مدام کی ہے ہم نے
یہ مہلتِ کم کہ جس کو کہتے ہیں عمر مَر مَر کے غرض تمام کی ہے ہم نے

سوؔدا نے مختلف موضوع پر رباعیاں کہی ہیں جو مدح، ہجو، ذاتی حالات، شاعرانہ تعلّی، مذہب، اخلاق اور حُسن وعشق کے موضوعات سے مملو ہیں مگر اُن کا اپنا کوئی خاص رنگ نہیں ہے۔ اُن کی یہ رباعی اپنے دَور میں مقبولِ خاص وعام ہوئی تھی:

سوؔدا پئے دنیا تُو بہ ہر سو کب تک؟ آوارہ اِزیں کوچہ بہ آں کُو کب تک؟
حاصل یہی اِس سے نا کہ تا دنیا ہو؟ بالفرض ہوا یوں بھی تو پھر تُو کب تک؟

قائمؔ چاندپوری نے صنفِ رباعی میں خوب طبع آزمائی کی ہے۔اُنھوں نے مذہب واخلاق اور دیگر موضوعات پر بہترین رباعیاں کہی ہیں۔وہ انسان کو عزّتِ نفس کا درس اس طرح دیتے ہیں:

کیا پشم ہیں دنیا کے یہ سب اہلِ نعیم عزت نہ کریں اپنی جو دے کر زر وسیم
مسجد میں خدا کو بھی نہ کی جے سجدہ محراب نہ ہو خم جو برائے تعظیم

میر حسنؔ نے اگرچہ اپنے تذکرہ ''تذکرۂ شعرائے اُردو'' میں اپنی دو رباعیوں کا ذکر کیا ہے مگر اُن کے کُلّیات میں رباعیوں کی تعداد سَو سے زیادہ ہے۔جن میں سے زیادہ تر حمد، منقبت، مرثیت، تصوف، پندونصائح اور مدح پر مشتمل ہیں اُن کی رباعیوں کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر وہ سنجیدگی سے رباعی کی طرف رجوع کرتے تو اُن کا شمار صفِ اوّل کے رباعی گو شعرا میں کیا جاتا۔ یہاں اُن کی ایک رباعی درج کی جارہی ہے:

ہر آن میں آپ کو دِکھا جاتے تھے مشتاق کو تسکین دِلا جاتے تھے
کیوں دیر لگی ہے؟ کس نے روکا تم کو؟ اب تک تو کئی بار تم آجاتے تھے

انشاء اللہ خاں اِنشاؔ ہرفن مولا تھے۔اُنھوں نے رباعی میں بھی اپنی کارگزاریوں کا مظاہرہ کیا ہے۔اُن کی بیش تر رباعیوں کا رنگ حُسن وتشنیع ہے اور کچھ رباعیاں ریختی کا بہترین نمونہ قرار دی جاسکتی ہیں مثلاً:

جھانکا تو نہ کر، عبث فضیحت ہوگی آ تو یہ سُنے گی تو قباحت ہوگی
چالیس یہ چھوڑ دے ، نہیں تو ناحق اک روز بڑی تیری فضیحت ہوگی

اس دَور میں صرف جرأتؔ نے سنجیدگی کے ساتھ رباعیاں کہی ہیں۔اُن کی رباعیوں میں عشقیہ مضامین اُسی طرح رچے بسے ہیں جو اُن کی غزلوں میں نمایاں ہیں۔اگرچہ شوخی، شرارت، چلبلا پن، معاملہ بندی اور نوک جھونک وغیرہ میں سطحیت ہے مگر سچّے جذبات بھی نمایاں طور پر نظر آتے ہیں مثلاً:

دیکھا جو کل اُس نے مِرے جی کا کھونا اور کھینچ کے آہِ سرد ہر دم رونا
منہ پھیر کے مسکرا کے چپکے سے کہا آسان نہیں کسی پہ عاشق ہونا

نظیرؔ اکبرآبادی کی رباعیوں کا رنگ اُن کے پیش رَو شعرا سے بالکل مختلف ہے جن میں سیدھی سادی نصیحت آمیز باتیں بیان کی گئی ہیں۔اخلاق اور واعظانہ مضامین سے مملو کچھ رباعیوں کے موضوعات حمد ونعت بھی ہیں مثلاً:

ہو کیوں نہ بتوں کی ہم کو دل سے چاہیں ہیں ناز و اَدا میں اُن کی کیا کیا راہیں
دل لینے کو سینے سے لپٹ کر کیا کیا ڈالی ہیں گلے میں پتلی پتلی باہیں

میر خلیقؔ نے بھی کچھ رباعیاں نظم کی تھیں جن میں سے اب تک اُن کی دو رُباعیاں ہی دَست یاب ہوسکی ہیں۔ان دو رباعیوں میں سے بھی ایک رثائیہ رباعی کو سندی تسلیم کیا جاسکتا ہے جو مندرج ہے:

عابد جو اُٹھا کے رنج و اِیذا آئے اک شور ہوا کہ شاہِ والا آئے
ہم جولیاں آئیں تو کہا صغریٰ نے کچھ تم نے سُنا : ہمارے بابا آئے

بہادرشاہ ظفؔر کی مدح، دال کی تعریف، شاعرانہ تعلّی اورغمِ روزگار کے موضوعات پر کہی گئیں غالبؔ کی رباعیوں میں وہ بلندی نہیں ہے جواُن کے کلام کی خصوصیت ہے۔پھر بھی اُن کی ایک رباعی درج کی جارہی ہے:

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال — ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال — ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ذوقؔ کی رباعیوں میں اُن کی غزلوں کی طرح روزمرّہ اورمحاورات کی زبان کا لطف پایا جاتا ہے۔اُن کی بیش تر رباعیاں حمد،نعت اور اہلِ بیت کی مدح کے رنگ میں ہیں۔اُن کی یہ رباعی بہت مشہور ہوئی تھی:

اِس جہل کا ہے ذوقؔ ٹھکانا کچھ بھی — ہم پڑھ کے ہوئے علم نہ دانا کچھ بھی
ہم جانتے تھے علم سے کچھ جانیں گے — جانا تو یہ جانا کہ نہ جانا کچھ بھی

مومنؔ کی رباعیاں اپنے موضوعات کی ہمہ گیری اورفنّی محاسن کی بنا پرانفرادیت کی حامل ہے۔وہ غزلوں کی طرح رباعیوں میں بھی نازک خیالی،خیال آفرینی،معاملہ بندی وغیرہ کو بڑے سلیقے سے نظم کرتے ہیں۔پیش ہےنمونتہً اُن کی ایک رباعی:

ہے عہدِ شباب زندگانی کا مَزا — پیری میں کہاں وہ نوجوانی کا مَزا
اب یہ بھی کوئی دن میں فسانہ ہوگا — باتوں میں جو باقی ہے کہانی کا مَزا

میرانیسؔ کی رباعیات کے موضوعات حمد ونعت، مذہبی معتقدات،صبروشکر، عجزوانکساری،اخلاق وموعظت، ذاتیات اورشاعرانہ تعلّی ہیں۔بطورِنمونہ پیش ہےاُن کی ایک رباعی:

آغوشِ لحد میں جب کہ سونا ہوگا — جز خاک نہ تکیہ نہ بچھونا ہوگا
تنہائی میں آہ کون ہووے گا انیسؔ — ہم ہوویں گے اور قبر کا کونا ہو گا

مرزادبیرؔ کی رباعیاں بھی مذہبی معتقدات،وفاداری،جاں نثاری،عجزوانکساری کے موضوعات پرمبنی ہیں،پیش ہےاُن کی ایک رباعی

پہونچا جو کمال کو ، وطن سے نکلا — قطرہ جو گہر بنا ، عدن سے نکلا
تکمیلِ کمال کی غریبی ہے دلیل — پختہ جو ثمر ہوا ، چمن سے نکلا

حالیؔ نے شعوری طور پراصلاحی اورتعمیری کاموں کے لئے رباعیاں کہی ہیں۔اُن کی رباعیات کے موضوعات عام طور پر دینی ودنیوی اصلاح وترقّی سے متعلّق ہیں مثلاً:

رونق ہے ہراک بزم کی اب غیبت میں — بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اَوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں — خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

اکبرؔالہٰ آبادی نے قوم کی اصلاح اورترقّی کے لئے اپنی غزلوں اورنظموں ہی کی طرح طنزوظرافت کے پیرایے میں رباعیاں بھی کہی ہیں۔اُن کی بعض رباعیاں سنجیدگی کا بہترین نمونہ بھی ہیں۔دراصل اکبرؔ نے اپنی فطری خوش طبعی کی بدولت رباعی کے ایک نئے اسلوب سے روشناس کرایا ہے۔بطورِنمونہ پیش ہےاُن کی ایک رباعی:

اَنوار اِس دَور کے دل افروز ہیں کم گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم
ہر چرب زبان نہیں ہے شمعِ اخلاص جلنے والے بہت ہیں ، دل سوز ہیں کم

اسمٰعیل میرٹھی کی رباعیوں میں مصلحانہ انداز کو نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے قوم و مُلک کی بہبودی اور ترقّی کے لئے متعدد رباعیاں کہی ہیں مثلاً :

پانی میں ہے آگ لگانا دشوار بہتے ہوئے دریا کو پھیر لانا دشوار
دشوار سہی مگر نہ اتنا جتنا بگڑی ہوئی قوم کو بنانا دشوار

پیارے صاحب رشید کا شمار ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ وہ زبان و بیان کے اعتبار سے اپنے اُستاد میر انیسؔ کے مقلد ہیں مگر بہ اعتبارِ موضوع اُن سے منفرد بھی ہیں۔ اُنہوں نے بڑھاپے یعنی ضعیفی کے موضوع پر کثیر تعداد میں بہترین رباعیاں کہی ہیں مثلاً :

ایسا بھی نہ انقلاب دیکھا ہوگا کیا میری طرح شباب دیکھا ہوگا
کہتا ہوں جو مَیں کہ تھی جوانی میری پیری کہتی ہے : خواب دیکھا ہوگا

امیرؔ مینائی کی نعتیہ رباعیوں میں ادبی شان اور شاعرانہ لطافت کی جلوہ گری ہے مثلاً :

ہیں زیرِ مزار خوابِ راحت میں حضور اب بھی ہے مگر فیض سے عالم معمور
یہ سرِّ خفی ہے عین اعلان و ظہور فانوس میں شمع ، ساری محفل میں نور

میر مہدی مجروحؔ کی رباعیات کا رنگ دہلوی ہے۔ اُن کی بیش تر رباعیوں کے عنوانات و موضوعات واقعاتِ کربلا، اہل بیت کی مدح اور وارداتِ عشق ہیں مثلاً :

اُن کو تو کبھی اِدھر کو آنا ہی نہیں قسمت میں ہماری چین پانا ہی نہیں
ہر اک کی بود و باش کی مقرر ہے جا پر یار کے ظلم کا ٹھکانا ہی نہیں

شادؔ عظیم آبادی کی بیش تر رباعیوں کا رنگ متغزلانہ ہے۔ اُنہوں نے معرفت و تصوف کے موضوعات پر بھی عمدہ رباعیاں کہی ہیں۔ بطورِ نمونہ پیش ہے اُن کی یہ رباعی:

تنہا ہے چراغ ، دُور پروانے ہیں اپنے جو تھے کل ، وہ آج بے گانے ہیں
بے رنگیِ دنیا کا نہ پوچھو احوال قصّے ہیں ، کہانیاں ہیں ، افسانے ہیں

فانیؔ بدایونی کی رباعیوں میں اُن کی غزلوں ہی کی طرح سوز و گداز، غم و درد اور یاس و حسرت کی فراوانی ہے۔ اُنہوں نے کچھ رباعیوں میں مذہب، عقائد، شاعرانہ تعلّی اور ذاتی حالات کا بھی اظہار کیا ہے۔ بطورِ نمونہ پیش ہے اُن کی یہ رباعی:

بجھتی ہی نہیں ، شمع جلے جاتی ہے کٹتی ہی ، نہیں رات ڈھلے جاتی ہے
جاری ہے نفس کی آمد و شُد فانیؔ سینے میں چھُری ہے کہ چلے جاتی ہے

سیمابؔ اکبرآبادی نے سیاسی، قومی، مُلکی مسائل اور جنگی رجحانات سے متاثر ہوکر متعدد رباعیاں کہی ہیں، مثلاً:

انسان بنا تھا عیش و عشرت کے لئے		اور اب محتاج ہے مسرّت کے لئے
یہ چاند یہ سورج یہ زماں اور مکاں		سب اِس کے لئے، یہ جنگ وغارت کے لئے

تلوک چند محرومؔ نے اپنی رباعیوں میں تعلیمِ نسواں، صنف نازک کی بے باکی، بے راہ روی اور بے حجابی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ خیال کی پاکیزگی اور بیان کی روانی اُن کی رباعیوں کی اہم خصوصیات ہیں۔ پیش ہے اُن کی یہ رباعی:

دنیا نے عجب رنگ جما رکھّا ہے		ہر اک کو غلام اپنا بنا رکھّا ہے
پھر لطف یہ ہے کہ جس سے پوچھو وہ کہے		اِس عالمِ آب و گِل میں کیا رکھّا ہے؟

جگت موہن لال رواںؔ کی رباعیاں وطنی، سیاسی اور قومی تصورات کی ترجمان ہیں۔ اُن کی رباعیاں ہندو تہذیب، مذہبی روایت، قومی و تاریخی سانحات اور واقعات جیسے موضوعات پر مبنی ہے مثلاً:

تابع ہمیں عقل کا کیے دیتی ہے		آزادیِ دل فنا کیے دیتی ہے
تہذیب کی عظمتوں سے باز آئے ہم		فطرت سے ہمیں جدا کیے دیتی ہے

علّامہ اقبالؔ نے دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ رباعیوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کی بیش تر رباعیاں بلند درجہ کی ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کی یہ رباعی:

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے		بتا کیا تو مِرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم		بخیلی ہے یہ رزّاقی نہیں ہے

اگر چہ عبدالباری آسیؔ کی رباعیوں میں انفرادیت مفقود ہے مگر اُنہوں نے یاس وحسرت اور رنج وغم کی بہترین ترجمانی کی ہے جیسے:

آسان بھی یہی ہے اور یہی مشکل ہے		دریا بھی یہی ہے اور یہی ساحل ہے
جو کچھ کرنا ہے زندگی میں، کر لو		غربت بھی یہی ہے اور یہی منزل ہے

یاس یگانہ چنگیزی کی رباعیوں میں اُن کی غزلوں ہی کی طرح تندی، تیزی، طرّاری، کڑک اور گرج کو نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُن کے یہاں حکیمانہ اور اخلاقی مضامین کے علاوہ عشق کی ہوسناکی بھی نظر آتی ہے مثلاً:

ہاں اے دلِ ایذا طلب! آرام نہ لے		بدنام نہ ہو، مفت کا الزام نہ لے
ہاتھ آ نہ سکے پھول تو کانٹے ہی سہی		ناکام پلٹنے کا کبھی نام نہ لے

اگر چہ آثر صہبائی کی رباعیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے مگر وہ اپنا منفرد اسلوب قائم نہ کر سکے۔ مختلف اساتذۂ سخن سے مشورۂ سخن کے نتیجے میں اُن کا اپنا کوئی رنگ واضح نہ ہوسکا۔ یہاں اُن کی ایک رباعی نقل کی جارہی ہے:

گزری ہے جگر کے زخم سیتے سیتے		زہرابِ اَلم کے جام پیتے پیتے
سَو بار اگر چہ کوہِ غم بھی ٹوٹے		گردن نہ کبھی جھکے گی جیتے جیتے

امجدؔ حیدرآبادی کو رباعی کے فن پر غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ وہ صوفی منش، متوکّل اور رحم دل انسان تھے۔ اُن کی بیش تر رباعیاں عارفانہ اور رندانہ سرمستیوں میں رچی بسی نظر آتی ہیں۔ بطورِ نمونہ پیش ہے اُن کی یہ رباعی:

ہیں مستِ مئے شہود تُو بھی مَیں بھی ہیں مدّعیِ نمود تُو بھی مَیں بھی
یا تُو ہی نہیں جہاں میں ، یا مَیں ہی نہیں ممکن نہیں دو وجود تُو بھی مَیں بھی

جوشؔ کی رباعیاں موضوع اور مواد کے اعتبار سے قابلِ قدر ہیں اُن کی رباعیوں کے موضوعات تصوّف، فلسفہ، اسرارِ حقیقت، عرفانِ ذات، رموزِ کائنات، شراب اور شباب ہیں۔ یہاں اُن کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

دل ہوتا ہے رُو بہ راہ گاہے گاہے رو لیتے ہیں بھر کے آہ گاہے گاہے
اِس ڈر سے کہیں خودی نہ بن جائے خدا کر لیتے ہیں ہم گناہ گاہے گاہے

شاکرؔ میرٹھی کی رباعیات کا رنگ شروع میں مجازی تھا لیکن اُن کی بعد کی رباعیاں حقیقت و عرفان کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ یہاں اُن کی ایک رباعی پیش کی جارہی ہے:

دنیا کی بلا سر سے ہٹی جاتی ہے میعاد اسیری کی گھٹی جاتی ہے
ہونے والی ہے قطع زنجیرِ حیات جو پاؤں کی بیڑی ہے ، کٹی جاتی ہے

فراقؔ گورکھ پوری کی رباعیات نے اُردو رباعیات کو ایک نئے رنگ و آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ اُن کی رباعیاں حبِّ الوطنی، شرنگار رس اور رومانیت کا بے مثال نمونہ ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہے اُن کی یہ رباعی ؎

کس پیار سے ہوتی ہے خفا بچّے سے کچھ تیوری چڑھائے ہوئے، منہ پھیرے ہوئے
اِس روٹھنے پہ پریم کا سنسار نثار کہتی ہے کہ جا تجھ سے نہیں بولیں گے

دورِ حاضر میں بھی رباعیاں خوب کہی جارہی ہیں۔ بعض رباعی گو شعرا کے رباعیات کے دواوین اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

01.06 خلاصہ

رباعی چار مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہوتی ہے۔ شاعر صرف چار مصرعوں میں اپنے خیالات کو مکمّل کرتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ یہ صرف بحرِ ہزج میں نظم کی جاتی ہے۔ عام طور پر رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے اگر تیسرے مصرع میں بھی قافیہ لایا جائے تو عیب نہیں۔ قافیہ کے اعتبار سے اسے رباعی مصرّع اور رباعی خصّی یا رباعی ناقص بھی کہا جاتا ہے۔ جس رباعی میں چاروں مصرعے مقفّیٰ ہوتے ہیں اُسے غیر خصّی رباعی یا مصرّع رباعی کہتے ہیں۔ اگر کسی رباعی کے تیسرے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا ہے تو اُسے رباعی خصّی یا رباعی ناقص کہا جاتا ہے۔ وقت اور اِرتقا کے ساتھ رباعی کے نام بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔ پہلے اسے ترانہ کہا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسے دوبیتی، چہار بیتی اور چہار مصراعی کہا جانے لگا۔ کچھ لوگ اسے جفتی یا خصّی بھی کہتے تھے۔

ابتدائی دَور کی رباعیاں عورتوں اور بچّوں کو خوش کرنے کے لئے کہی جاتی تھیں۔ چوں کہ رباعی کا وزن موسیقی سے خاص مناسبت رکھتا ہے اس لئے شعرا اور مغنّی اسے گا کر پڑھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عورتوں اور بچّوں کو یہ صنفِ سخن بہت پسند تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد اس صنفِ سخن میں تصوف کے مسائل کے علاوہ حمد، نعت اور منقبت سے تعلّق رکھنے والے مضامین نظم کیے جانے لگے۔ اس صنف کی رسائی بہت جلد دربار

میں بھی ہوگئی۔ رباعی گوشعرااس صنف کے ذریعہ اربابِ حکومت اور امراء کی مدح وستائش اور مطلب برآری کرنے لگے۔ سلاطینِ وقت کے حکم کی تعمیل میں درباری شعرا واقعات وسانحات کو بھی رباعی میں نظم کرنے لگے۔ ہنگامی حالات میں بھی رباعیاں کہی جانے لگیں۔ تہنیت، شکوہ وشکایت، معذرت، طلب، احسان مندی وغیرہ کا اظہار بھی رباعی کے ذریعہ کیا جانے لگا۔ کچھ شاہانِ مملکت خود شاعر تھے۔ چوں کہ وہ عیش و عشرت اور رنگ رلیوں میں مبتلا رہتے تھے اس لئے اُن کی بیش تر رباعیات کا رنگ عشقیہ ہے۔ اُن کے یہاں حمد، نعت، منقبت، تصوف، شہدائے کربلا اور اخلاق کے موضوعات پر بھی کچھ رباعیاں نظر آتی ہیں۔

رباعی کی ابتدا کے بارے میں مشہور ہے کہ امیر یعقوب بن لیث صفّار کا بیٹا اپنے ساتھیوں کے ساتھ گڑھے میں جوز پھینکنے کے کھیل میں مشغول تھا۔ اُس نے گڑھے میں داخل کرنے کے لئے آٹھ جوز پھینکے۔ سات جوز تو گڑھے میں داخل ہو گئے مگر ایک جوز باہر ہی رہ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آٹھواں جوز بھی لڑھک کر گڑھے کے اندر چلا گیا۔ فرطِ انبساط میں امیر یعقوب کا بیٹا چلاّ اُٹھا: ''غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو''۔ امیر یعقوب بچّوں کے کھیل سے محظوظ ہورہا تھا۔ اُس نے بیٹے کے مُنہ سے نکلے ہوئے الفاظ کی تقطیع کرائی تو اُسے بحرِ ہزج میں موزوں پایا۔ اسی وزن کے تین مصرع کہہ کر اُسی وقت اسے رباعی کی ہیئت میں تبدیل کر دیا گیا۔ عرب میں رباعی کہنے کا دستور نہیں تھا۔ یہ اہلِ عجم یعنی ایران کی ایجاد ہے۔

اُردو میں رباعی کا پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ بعض محقّقین غلط فہمی کی بنا پر مُلاّ وجہی کو اور بعض عبدالقادر حیدرآبادی کو اُردو کا پہلا رباعی گو شاعر ثابت کرتے ہیں۔ دکن میں سراجؔ اورنگ آبادی اور ولیؔ نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ شمالی ہند میں دردؔ، میرؔ، سوداؔ، میر حسن اور اُن کے تلامذہ نے بھی کم وبیش رباعیاں کہی ہیں۔ اس عہد کے دیگر شعرا میں حسرتؔ دہلوی، بہادر علی حشمتؔ، عبدالحیٔ تاباںؔ، شیخ قیام الدین قائمؔ چاندپوری، محمد حُسین کلیم، احسن اللہ بیانؔ، عزیز بھکاری اور میر سوزؔ کی رباعیاں بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان شعرا کی بیش تر رباعیاں مذہب، تصوف، اخلاق اور حُسن وعشق کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ لکھنوی شعرا میں انشاء اللہ خاں اِنشاؔ، قلندر بخش جرأتؔ نے بھی مختلف موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں۔ نظیرؔ اکبرآبادی کی رباعیاں درسِ اخلاق اور پند وموعظت کے موضوعات سے مملو ہیں۔

میر انیسؔ، مرزا دبیرؔ اور اُن کے ہم عصر شعرا نے رباعی گوئی کو جلا بخشی۔ اُنھوں نے رباعی کو روایتی موضوعات کے دائرے سے نکال کر زندگی کی اخلاقی قدروں کا آئینہ دار بنا دیا۔ مرزا اسداللہ خاں غالبؔ، مومن خاں مومنؔ، شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، مصطفٰی خاں شیفتہؔ، میر مہدی مجروحؔ نے دیگر اصنافِ سخن کے علاوہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ الطاف حُسین حالیؔ اور اکبرؔ الہ آدی نے اخلاق اور اصلاحِ معاشرہ کو اپنی رباعیات کا موضوع بنایا۔ اسمٰعیل میرٹھی، امیرؔ مینائی اور پیارے صاحب رشید نے بھی رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ شادؔ عظیم آبادی، داغؔ دہلوی اور عزیزؔ لکھنوی نے بھی چند رباعیاں نظم کی ہیں۔ شوکت علی خاں فانیؔ، امجدؔ حیدرآبادی، شاکرؔ میرٹھی، شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی، سیمابؔ اکبرآبادی، رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری، تلوک چند محرومؔ، جگت موہن لال رواںؔ، علاّمہ اقبالؔ، عبدالباری آسیؔ، یاس یگانہ چنگیزی اور آثرؔ صہبائی کو رباعی گوئی میں مہارت حاصل تھی۔ ان شعرا نے مختلف موضوعات پر رباعیاں کہی ہیں۔ امجدؔ حیدرآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھ پوری اور رواںؔ کا شمار ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ خواجہ دل محمد دلؔ، صفیہ شمیمؔ ملیح آبادی، حیدرؔ دہلوی، وحشتؔ کلکتوی، فارغؔ بخاری، پروفیسر سوزؔ، جگن ناتھ آزادؔ، اقبال حُسین شوقؔ نے بھی رباعیوں پر خوب طبع آزمائی کی ہے۔ دَورِ حاضر میں بھی متعدد شعرا رباعیاں کہہ رہے ہیں جن میں سے بعض شعرا کے دواوین اور مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔

01.07 فرہنگ

آتون	: اُستانی، معلّمہ، لڑکیوں کو پڑھانے والی
آمدوشُد	: آمدورفت، آنا جانا
آہ بھرنا	: سانس کھینچ کر غم وافسوس کا اظہار کرنا
آہِ سرد کھینچنا	: ٹھنڈی سانس لینا
ابھوں	: اب بھی، ابھی
اشارے سوں کہا	: اشارہ کیا، آنکھ، بھَوں، ہاتھ یا جس کے کسی عضو کے ذریعہ اپنی بات یا اپنے مقصد کا اظہار کرنا
اشارے میں کہا	: اشارہ کیا، آنکھ، بھَوں، ہاتھ یا جس کے کسی عضو کے ذریعہ اپنی بات یا اپنے مقصد کا اظہار کیا
اگن	: آگ
الزام لینا	: اپنے اوپر بدنامی لینا، خوش کو قصوروار ٹھہرانا
انوار	: نور کی جمع، روشنی، تجلّیاں، چمک دمک، رونقیں
ایذا طلب	: تکلیف میں مبتلا ہونے کا خواہش مند
اہلِ نعیم	: نعمت و مال و دولت والے، مالدار، زردار
باج	: بغیر، بنا
بالفرض	: تسلیم کیا، مانا، فرض کیا، سہی
بُت	: معشوق، مورتی، مجسّمہ
بُجھنا	: گُل ہونا، جلتی ہوئی چیز کا ٹھنڈا ہونا
بدگوئی	: غیبت، چغلی، برائی
بودوباش	: سکونت، قیام
بیڑی	: لوہے کی زنجیر جو مجرموں کے پیروں، ہاتھوں اور گردن میں ڈالی جاتی ہے
بیگانہ	: غیر، پرایا، اجنبی
ساغرِ مے	: شراب کا پیالہ، جامِ شراب
سجدہ کرنا	: سر جھکانا، زمین پر پیشانی رکھ کر عبادت کرنا
سِرّ	: راز، بھید
سکھی	: سہیلی، ساتھن
سنسار	: دنیا، کائنات، جہان
سَو بار	: بارہا، سَو مرتبہ
سینے سے لپٹنا	: چھاتی سے چمٹنا، چھاتی لگنا
شاہ پسند	: بادشاہ پسند، وہ چیز جو بادشاہ کو مرغوب ہو
شاہِ جم جاہ	: جمشید بادشاہ کے مرتبہ کا بادشاہ، نہایت سخی
شگفتہ ہونا	: خوش ہونا، کِھلنا
شور ہونا	: غل ہونا، شور اُٹھنا، دھوم پڑنا، دھوم مچنا
شیشہ	: قرابہ، بوتل، خُم، صراحی، شراب رکھنے کا برتن
عاشق ہونا	: فدا ہونا، فریفتہ ہونا
عالمِ آب و گِل	: پانی و مٹّی کی دنیا، دنیا، عالم، کائنات، ارض
عہدِ شباب	: زمانۂ شباب، جوانی کے دن
عیش وعشرت	: مسرّت و آرام، خوشی و انبساط، نشاط و مسرّت
عین	: بالکل، ٹھیک
غربت رغریبی	: مسافرت، بے وطنی
غلام بنانا	: تابع کرنا، مطیع کرنا، ماتحت کرنا
غم کے کوہ ٹوٹنا	: مسلسل مصیبت نازل ہونا
فانوس	: بڑی قندیل، ایک قسم کا شمع دان جو ہواؤں سے شمع کی حفاظت کرتا ہے
فضیحت ہونا	: ذلّت ہونا، بدنامی ہونا، رسوائی ہونا
قطع ہونا	: کٹ جانا، ٹوٹ جانا
قیامت ہونا	: مصیبت ہونا، عافت ہونا، مصیبت نازل ہونا

پیا : محبوب، معشوق، شوہر

پھولنا : کِھلنا، شگفتہ ہونا

تائب ہونا : گُناہ نہ کرنے کا عہد کرنا

تجھ : تیرے، تیرے کی بدلی ہوئی حالت

تسکین دلانا : تسلّی دلانا، دلاسہ دلانا، ڈھارس بندھانا

تکمیل : کمال کی تکمیل، پورا، مکمّل

تمام کرنا : پوری کرنا، پورا کرنا، مکمّل کرنا، ختم کرنا

تیوری چڑھانا : چیں بجبیں ہونا، پیشانی پر شکن ڈالنا، ماتھے پر بل ڈال کر غصّہ یا ناراضی کا اظہار کرنا

جوں : جیسے، طرح، مانند، مثل

جہل : جہالت، لاعلمی، حماقت

جی کا کھونا : مضطرب ہونا، بے چین ہونا، جان کا ہلکان کرنا

چالیں : چال کی جمع، چالاکیاں، شرارتیں

چرب زباں : چکنی چپڑی باتیں کرنے والا، خوشامدی

چھُری چلنا : ایذا ہونا، رنج پہنچنا، صدمہ پہنچنا

خم ہونا : جھُکنا، خمیدہ ہونا

خواب دیکھنا : سوتے میں کسی منظر کو دیکھنا، سَپنا دیکھنا

خوابِ راحت : آرام کی نیند، میٹھی نیند

خودی : انانیت، خوش شناسی، غرور، تکبّر

خونابہ کشی کرنا : خون پینا، لہو کے گھونٹ پینا، خون کے آنسو پینا

دال ہونا : دلالت ہونا، شان وشوکت ظاہر ہونا

دل افروز : دل کو منوّر یا روشن کرنے والا

دل سوز : غم خوار، ہم دِرد

دل لینا : عاشق بنانا، فریفتہ کر لینا

ڈھلنا : گزرنا، ختم ہونا، تمام ہونا

کمال کو پہونچنا : مہارت ہونا، کامل ہونا، کمال حاصل ہونا

کوئی دن : کسی دن، کسی وقت، کبھی

کیا رکھا ہے : کیا خصوصیت ہے، کیا خاص بات ہے یعنی کوئی خاص بات نہیں ہے

گاہے گاہے : کبھی کبھی، کسی کسی وقت

گردن جھکنا : اطاعت کرنا، متابعت کرنا، عاجزی رمنّت کرنا

گزرنا : بسر ہونا، بیتنا

گلے میں باہیں ڈالنا : گردن میں ہاتھ ڈال کر محبت کا اظہار کرنا، گردن میں باہیں حمائل کرنا

لالہ لالہ : ایک قِسم کا سُرخ پھول جس میں سیاہ داغ ہے

محراب : وہ قوس یا کمان نما جگہ جہاں امام نماز پڑھاتا ہے

مستِ شہود : ہر شے میں جلوۂ حق کے دیدار سے سرشار رہنا

مُفت کا الزام : بے وجہ کا بہتان، تہمتِ ناحق

مُکھ : چہرہ، صورت، شکل، مُنہ

مُنہ پھیرنا : رُوگرداں ہونا، رُخ موڑنا

میعاد : مقررّہ وقت، معیّنہ مدّت

ناحق : حق کے خلاف، نامناسب، بے وجہ

ناکام پلٹنا : نامراد واپس آنا، ناکامیاب لوٹنا

نرگس : ایک قِسم کا پھول جسے آنکھ سے تشبیہ دی جاتی ہے

نمود : شان وشوکت، کرّ وفر

نئیں : نہیں

نیرنگیٔ دنیا : دنیا کے مختلف رنگ ڈھنگ، دنیا کے

روبراہ	: تیّار، مستعد، کمربستہ	طلسمات	
روٹھنا	: خفاہونا، ناراض ہونا	ہات اُٹھانا	: ہاتھ اُٹھانا، کنارہ کش ہونا، دست بردار ہونا
زروسیم	: دولت اور چاندی، مال وزر، دھن دولت	ہاتھ نہ آسکنا	: حاصل نہ ہونا، نہ ملنا
زنجیرحیات	: زندگی کی زنجیر، زندگی کی ڈور	ہرآن	: ہرلمحہ، ہروقت، ہرگھڑی
زہراب	: زہرملاہواپانی، زہریلاپانی	ہنسنا	: مذاق اُڑانا، ہنسی اُڑانا، تضحیک کرنا

01.08 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ رباعی کی تعریف اپنے الفاظ میں کیجیے۔

سوال نمبر۲ اکبرالہ آبادی کی رباعیات کی بنیادی خصوصیات کیا ہیں؟ بیان کیجیے۔

سوال نمبر۳ خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی رباعیوں کی اہم خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ رباعی کی ابتدا کے واقعہ کو اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

سوال نمبر۲ ''رباعی کے مختلف نام'' کے عنوان سے ایک جامع مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۳ شمالی ہند کے چند رباعی گوشعرا کی رباعیات کی بنیادی خصوصیات پر روشنی ڈالیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : رباعی میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

(الف) دو (ب) چار (ج) چھ (د) آٹھ

سوال نمبر۲ : ابتدائی دَور میں رباعی کو کیا کہا جاتا تھا؟

(الف) ترانہ (ب) تمہید (ج) قطعہ (د) مختصر ترین نظم

سوال نمبر۳ : رباعی کے مختلف ناموں میں سے کون سا نام رباعی کا نہیں ہے؟

(الف) چہاربیتی (ب) چہارمصراعی (ج) چومصرعی (د) دوبیتی

سوال نمبر۴ : ابتدا میں رباعی کہنے کا مقصد کیا تھا؟

(الف) اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانا (ب) مشقِ سخن کرنا

(ج) روتوں کو ہنسانا اور ہنستوں کو رُلانا (د) عورتوں اور بچّوں کو خوش کرنا

سوال نمبر۵ : ''غلطاں غلطاں ہمی رود تالبِ گو'' یہ الفاظ اپنے مُنہ سے نکالنے والا کون تھا؟

(الف) زینت الکعب (ب) امیر یعقوب بن صفّار کا بیٹا (ج) ابوولف (د) امیر یعقوب بن صفّار کا ایک مصاحب

سوال نمبر۶ : رباعی کس مُلک کی ایجاد ہے؟

(الف) عرب (ب) ایران (ج) ہندوستان (د) چین

سوال نمبر۷ : عمرخیّام نے کس زبان میں رباعیاں کہی ہیں؟

(الف) فارسی (ب) عربی (ج) اردو (د) پشتو

سوال نمبر۸ : ''غلطاں غلطاں ہمی رودتالبِ گو'' کس بحر میں ہے؟

(الف) بحررجز (ب) بحررمل (ج) بحرہزج (د) بحرکامل

سوال نمبر۹ : اُردو کا پہلا رباعی گوشاعر کسے تسلیم کیا جاتا ہے؟

(الف) مُلاوجہی (ب) عبدالقادرحیدرآبادی (ج) ولی دکنی (د) محمدقلی قطب شاہ

سوال نمبر۱۰ : ''اردو رباعیات'' کا مصنّف کون ہے؟

(الف) ڈاکٹرسلام سندیلوی (ب) حامدحسن قادری (ج) ڈاکٹرفرمان فتح پوری (د) نجم الغنی خاں نجمی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) چار

جواب نمبر۲ : (الف) ترانہ

جواب نمبر۳ : (ج) چومصرعی

جواب نمبر۴ : (د) عورتوں اوربچّوں کو خوش کرنا

جواب نمبر۵ : (ب)امیر یعقوب بن صفّار کا بیٹا

جواب نمبر۶ : (ب) ایران

جواب نمبر۷ : (الف)فارسی

جواب نمبر۸ : (ج) بحرہزج

جواب نمبر۹ : (د) محمدقلی قطب شاہ

جواب نمبر۱۰ : (الف) ڈاکٹرسلام سندیلوی

01.09 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو رباعیات از ڈاکٹرسلام سندیلوی

۲۔ اردوشاعری کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹرفرمان فتح پوری

۳۔ مجموعۂ رباعیاتِ انیسؔ مرحوم از سیّدمحمّدعبّاس

۴۔ تاریخ وتنقیدادبیاتِ اُردو از حامدحسن قادری

اکائی 02 رباعی کافن

ساخت

02.01 : اغراض ومقاصد
02.02 : تمہید
02.03 : رباعی کی ظاہری ہیئت
02.04 : رباعی کےاَوزان
02.05 : رباعی کے بارہ نئےاَوزان
02.06 : عروض کے بنیادی اُصول
02.07 : خلاصہ
02.08 : فرہنگ
02.09 : سوالات
02.10 : حوالہ جاتی کتب

02.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو رباعی کے فن کے بارے میں معلومات فراہم کرنا ہے۔ رباعی محض چار مصرعوں کی ایک چھوٹی سی نظم ہی نہیں ہوتی ہے بلکہ اُس کی ظاہری ہیئت بھی ہے اور فنّی بھی۔ جنہیں سمجھے بغیر ہم یا آپ رباعی کی پہچان نہیں کر سکتے ہیں۔ رباعی کی شناخت کے لئے جن بنیادی باتوں کا جاننا ضروری ہے اُن کا ذکر اس اکائی میں کیا گیا ہے۔

اس اکائی میں رباعی کے فن اور اُس کی ظاہری ہیئت کے علاوہ عروض کے بنیادی اصول، وزن، بحر اور زحافات وغیرہ کے بارے میں بھی مختصر معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ شعر کی تقطیع کرنے کے طریقے کو بھی عام فہم انداز میں سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر آپ رباعی کے فن اور اُس سے متعلّق دیگر ضروری چیزوں کا مطالعہ تھوڑی سی بھی لگن، گہرائی اور گیرائی سے کریں گے تو آپ نہ صرف رباعی کے فن سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں گے بلکہ دیگر اصنافِ سخن کے فن میں بھی دل چسپی لینے لگیں گے۔

02.02 تمہید

آپ نے نثر اور نظم کی مختلف اصنافِ سخن کے بارے میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا ہوگا۔ نثر میں داستان، ناول، افسانہ، ڈرامہ، انشائیہ، مضمون وغیرہ مشہور اصناف ہیں۔ نظم میں غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی وغیرہ کا شمار مقبول ترین اصناف میں کیا جاتا ہے۔ ہر صنف سخن کے کچھ قاعدے مقرر کر دیے گئے ہیں جن کی کسوٹی پر انہیں کسا یا پرکھا جاتا ہے۔ خواہ نثری اصناف ہوں یا شعری اصناف، ہر صنف سخن کی ظاہری

ہیئت بھی ہوتی ہے اور فنّی بھی۔ ظاہری ہیئت کے ذریعہ ایک نظر میں بڑی حد تک پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کوئی تخلیق غزل ہے یا نظم، قصیدہ ہے یا مثنوی، مخمس ہے یا مسدّس، رباعی ہے یا قطعہ، ماہیہ ہے یا سانیٹ وغیرہ۔

کوئی بھی تخلیق فنّی اعتبار سے کس بحر میں ہے، اُس کا پتہ اُس وقت تک نہیں لگایا جاسکتا جب تک اُس کی تقطیع نہ کی جائے۔ بیش تر شعری صنف سخن کے لئے یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ کسی بھی وزن یا بحر میں کہی جاسکتی ہیں مگر رباعی کے لئے ایک مخصوص بحر ہے جس کا نام ''ہزج'' ہے۔ اگر چار مصرعوں والی کسی نظم کی ظاہری ہیئت رباعی جیسی ہو مگر وہ بحر ہزج میں نظم نہ کی گئی ہو تو اُسے رباعی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس اکائی میں بحر ہزج سے متعلّق تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سچ ہے کہ وزن اور شعری بحروں کے مطالعہ کا شمار خشک اور غیر دل چسپ موضوعات میں کیا جاتا ہے۔ اگر آپ غور وفکر کے ساتھ رباعی کے فن کا مطالعہ کریں تو یقیناً آپ کے لئے دل چسپی کے سامان فراہم ہوں گے۔

02.03 رباعی کی ظاہری ہیئت

شاعری کی اصطلاح میں رباعی اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس میں چار مصرعے یعنی دو شعر ہوتے ہیں۔ یہی رباعی کی ظاہری ہیئت ہے اور انہیں چاروں مصرعوں میں مکمّل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ یہ بحرِ ہزج میں نظم کی جاتی ہے۔ اس کے پہلے، دوسرے اور تیسرے مصرعے میں قافیہ کی پابندی لازمی ہے۔ اگر تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ رباعی کے آخری دو مصرعوں بالخصوص چوتھے مصرعے پر پوری رباعی کے حُسن، اثر اور زور کا دارومدار ہوتا ہے۔

ابتدا میں رباعی کے چاروں مصرعے باہم مقفّٰی ہوتے تھے یعنی چاروں مصرعوں میں قافیہ نظم کیا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد تیسرے مصرع سے قافیہ حذف کر دیا گیا لیکن اب بھی کچھ اساتذۂ فن ایسی رباعیاں نظم کر رہے ہیں جن کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں یعنی چاروں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے۔ اگر کوئی شعری تخلیق معنوی طور پر چار مصرعوں پر مشتمل ہو اور جس کے چاروں مصرعے بھی ہم قافیہ ہوں یا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع مقفّٰی ہو مگر وہ بحرِ ہزج میں نہ ہو تو اُسے رباعی نہیں کہا جاسکتا جیسے یہ چار مصرعے۔

ترے شیشے میں مَے باقی نہیں ہے بتا کیا تُو مِرا ساقی نہیں ہے؟
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم بخیلی ہے؟ یہ رزّاقی نہیں ہے؟

جس رباعی کے تیسرے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا ہے اُسے رباعی خصّی کہا جاتا ہے اور جس رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اُسے رباعی غیر خصّی کہتے ہیں۔ کچھ لوگ خصّی رباعی کو غیر مصرّع یا ناقص اور غیر خصّی رباعی کو مصرع رباعی بھی کہتے ہیں۔ آپ غیر خصّی اور خصّی رباعی یا مصرّع اور غیر مصرّع رباعی کی ہیئت کو آسانی سے سمجھ سکیں اس لئے بطورِ نمونہ دونوں طرح کی رباعیاں ذیل میں درج ہیں۔

خصّی رباعیاں

کیا تم سے بتائیں، عمرِ فانی کیا تھی؟ بچپن کیا چیز تھا؟ جوانی کیا تھی؟
یہ گُل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی (رواںؔ)

☆

اِس دل میں ذرا یقین کی شان نہیں	کہنے کو تو زندہ ہیں مگر جان نہیں	
ہےاورنہیں کے درمیاں ہے دن رات	جگنو کی چمک ہے، اپنا ایمان نہیں	(امجدؔ)

☆

کیا شیخ کی خشک زندگانی گزری	بے چارے کی اک شب نہ سہانی گزری	
دوزخ کے تخیّل میں بُڑھاپا بیتا	جنّت کی دعاؤں میں جوانی گزری	(جوشؔ)

غیر خصّی رباعیاں

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	آثارِ جلالی و جمالی باہم	
ہوں شاد نہ کیوں سافِل و عالی باہم	ہے اب کے شبِ قدر و دِوالی باہم	(غالبؔ)

☆

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان	برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان	
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان	یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان	(حالیؔ)

☆

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سرگم	ہو رقص میں جیسے رنگ و بو کا عالَم	
جگمگ جگمگ ہے شبنمستانِ ارم	یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم	(فراقؔ)

02.04 رباعی کے اَوزان

رباعی بحرِ ہزج میں نظم کی جاتی ہے۔اگر بحرِ ہزج کے علاوہ کسی دیگر بحر میں چار مصرعے موزوں کیے گئے ہوں تو اُسے رباعی نہیں کہیں گے۔روایتی عَروض کے مطابق رباعی کے ۲۴/اوزان مقرر ہیں جو بحر ہزج سے حاصل کیے گئے ہیں۔ان چوبیس اوزان میں سے بارہ اوزان ''شجرۂ اخرب'' میں داخل ہیں اور بارہ اوزان ''شجرۂ اخرم'' میں داخل ہیں جو مندرج ہیں۔

﴿شجرۂ اخرب﴾

1	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فاع
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم مخنق
2	مفعولن	مفعول	مفاعیلن	فاع
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	اہتم مخنق
3	مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعل
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب
4	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فاع
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	اہتم مخنق

5	مفعولن	مفعولن	مفعولن	فع مخنق
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب
6	مفعولن	فاعلن	مفاعیلن	فع
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	مجبوب مخنق
7	مفعولن	مفعول	مفاعیل	فعول
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	اہتم
8	مفعولن	مفعول	مفاعیلن	فع
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب مخنق
9	مفعولن	مفعولن	مفعول	فعل
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	مجبوب
10	مفعولن	مفعول	مفاعیل	فعل
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف	مجبوب
11	مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعول
	اخرب	مقبوض مخنق	مکفوف	اہتم
12	مفعولن	مفعولن	مفعول	فعول
	اخرب	مکفوف مخنق	مکفوف مخنق	اہتم

شجرۂ اخرم

1	مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فاع
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم مخنق
2	مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فاع
	اخرب	مکفوف	مکفوف	اہتم مخنق
3	مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعل
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب
4	مفعول	مفاعیلن	مفعولن	فاع
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	اہتم مخنق
5	مفعول	مفاعلن	مفاعیلن	فع
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب مخنق

6	مفعول	مفاعیل	مفاعیلن	فع
	اخرب	مکفوف	مکفوف	مجبوب مخنق
7	مفعول	مفاعیلن	مفعول	فعول
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	اہتم
8	مفعول	مفاعیلن	مفعولن	فع
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب مخنق
9	مفعول	مفاعیلن	مفعول	فعل
	اخرب	مکفوف	مکفوف مخنق	مجبوب
10	مفعول	مفاعیل	مفاعیل	فعول
	اخرب	مکفوف	مکفوف	اہتم
11	مفعول	مفاعلن	مفاعیل	فعول
	اخرب	مقبوض	مکفوف	اہتم
12	مفعول	مفاعلن	مفاعیل	فعل
	اخرب	مقبوض	مکفوف	مجبوب

''شجرۂ اخرب'' اور ''شجرۂ اخرم'' کے یہی بارہ بارہ یعنی کُل چوبیس اوزان، روایتی اوزان ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ رباعی کے چاروں مصرعے چوبیس میں سے کسی ایک ہی وزن میں ہوں۔ دونوں شجروں کے اوزان کو ایک دوسرے سے منسلک کیا جا سکتا ہے جو بالکل جائز ہے۔ واضح ہو کہ چوبیس اوزان کے باہم اشتراک سے بے شمار شکلیں برآمد ہوں گی۔ صاحبِ بحر الفصاحت نجم الغنی خاں نجمی نے تحریر کیا ہے کہ ان کے اشتراک سے کم از کم بیاسی ہزار نَو سَو چوالیس شکلیں بن سکتی ہیں جن کے اوزان یا ترتیبِ مصاریع میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اوزان کی اس قدر کثرت اور مشکلات کے سبب اکثر اُستاذ الشعرا بھی رباعی نظم کرنے میں دھوکا کھا جاتے ہیں۔

02.05 رباعی کے بارہ نئے اَوزان

بعض عروض داں نے رباعی کے بارہ اور اَوزان دریافت کیے ہیں جو رباعی کے روایتی اور مخصوص چوبیس اوزان کے علاوہ ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ حشوِ اوّل کی طرح حشوِ دوم یعنی دوسرے رکن کی جگہ تیسرا رکن بھی صرف مکفوف ہی نہیں بلکہ مقبوض بھی استعمال کیا جائے تو دو بنیادی اَوزان حاصل ہوں گے جو مندرج ہیں۔

1	مفعولُ	مفاعیلُ	مفاعلن	فعل/فعول
2	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعل/فعول

مندرجہ بالا دونوں بنیادی اوزان یعنی عروض و ضرب کو اگر الگ الگ کر کے شمار کریں تو چاروں بنیادی اوزان پر عملِ تخنیق سے مزید بارہ اوزان حاصل کیے جا سکتے ہیں جو اس طرح ہوں گے:

اوّل پہلے وزن پرعملِ تخنیق حاصل ہونے والی آٹھ شکلیں اس طرح ہوں گی :

1	مفعولُ	مفاعیل	مفاعلن	فعل
	اخرب	مکفوف	مقبوض	مجبوب
2	مفعولُ	مفاعیلن	فاعلن	فعل
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	مجبوب
3	مفعولن	مفعول	مفاعلن	فعل
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض	مجبوب
4	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فعل
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	مجبوب
5	مفعول	مفاعیل	مفاعلن	فعول
	اخرب	مکفوف	مقبوظ	اہتم
6	مفعول	مفاعیلن	فاعلن	فعول
	اخرب	مکفوف	مقبوض مخنق	اہتم
7	مفعولن	مفعول	مفاعلن	فعول
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوظ	اہتم
8	مفعولن	مفعولن	فاعلن	فعول
	اخرب	مکفوف مخنق	مقبوض مخنق	اہتم

دوسرے بنیادی وزن سے حاصل ہونے والی چار شکلیں اس طرح ہوں گی :

1	مفعولُ	مفاعلن	مفاعلن	فعل
	اخرب	مقبوض	مقبوض	مجبوب
2	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فعل
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	مجبوب
3	مفعول	مفاعلن	مفاعلن	فعول
	اخرب	مقبوض	مقبوض	اہتم
4	مفعولن	فاعلن	مفاعلن	فعول
	اخرب	مقبوض مخنق	مقبوض	اہتم

اس طرح آٹھ اور چار کُل بارہ نئے اوزان حاصل کیے جاسکتے ہیں۔ رباعی کے چوبیس روایتی اور بارہ نئے اوزان جوڑنے سے اَوزانِ رباعی کی مجموعی تعداد چھتیس ہو جاتی ہے۔

02.06 عروض کے بنیادی اُصول

عروض ایک فن کا نام ہے جس کے ذریعہ اشعار کا وزن معلوم کیا جاتا ہے۔ عروض کا موجد ایک عالمِ ادب خلیل ابنِ احمد ہے جسے مکّی کہا جاتا ہے مگر جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ خلیل ابن احمد مکّی نہیں بلکہ ایرانی تھا۔ اُس نے چند وزن مقرر کیے تھے اور ہر وزن کے نام کی ایک بحر تھی۔ اس کے بعد ضرورت کے تحت بحروں میں اضافہ ہوتا گیا۔

شاعری اور عروض کا تعلّق صوتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ جب کسی شعر کو عروض کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے تو ساری توجّہ اُس کی قرأت پر مرکوز کی جاتی ہے۔ ہمیں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ وزن کا تعلّق تلفّظ سے ہے نہ کہ تحریر یا رسم خط سے۔

جب الفاظ کا تلفّظ اور اُن کا املا ایک جیسا ہوتا ہے تب شعر کی تقطیع کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی ہے لیکن جب تحریر یعنی املا اور تلفّظ میں یکسانیت نہیں ہوتی ہے تو شعر کی تقطیع کرنا قدرے مشکل ہوتا ہے جیسے ''خواب'' کو ''خاب''؛ ''خوش'' کو ''خُش''؛ ''بالکل'' کو ''بِل کُل''؛ ''عبداللہ'' کو ''عَب دُل لا''؛ ''دل وجگر'' کو ''دِلِ جگر''؛ ''گل وبُلبُل'' کو ''گُلُ بُل بُل'' یا ''گُلو بُل بُل''؛ ''ہمہ تن گوش'' کو ''ہَم تَن گُوش''؛ ''مثلاً'' کو ''مَث لَن''؛ ''دارالحکومت'' کو ''کو دا رُل حُ کُو مَت''؛ ''دو دِچراغِ محفل'' کو ''دو دے چَ راغِ مح فِل'' یا ''دو دِچَ راغِ مح فِل''؛ وبالِ جاں'' کو ''وَبالے جا'' یا ''وَبالِ جاں''؛ ''ماہِ کامل'' کو ''ماہے کامِل''؛ ''دل آویز'' کو ''دِلا ویز''؛ ''آئینہ'' کو ''آئی نا'' یا ''آ ءِ نہ'' یا ''آئی نہ''؛ ''اور'' کو ''اُر'' پڑھ سکتے ہیں۔ حروف اور تراکیب کی ایسی ہی بے شمار شکلیں ہو سکتی ہیں لیکن یہ بات ہمیشہ یاد رکھیے کہ جب تحریر اور تلفّظ میں فرق ہوتا ہے تب عروض داں یا تقطیع کرنے والے کو صرف عبارت یا شعر کے تلفّظ سے سروکار رکھنا چاہیے، اُس کی تحریر یا اُس کے املا سے نہیں۔

تحریر اور تلفّظ میں فرق ہونے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ اوّل یہ کہ بعض حروف تحریر میں تو ہوتے ہیں مگر اُن کا تلفّظ نہیں کیا جاتا ہے۔ ایسے حروف کو مکتوبی غیر ملفوظی کہتے ہیں۔ دوسری قسم کی وہ آوازیں ہیں جو تلفّظ میں تو شامل کر لی جاتی ہیں مگر تحریر میں نہیں ہوتی ہیں۔ اُنھیں ملفوظی غیر مکتوبی کہا جاتا ہے۔ عروض میں پہلی قسم یعنی مکتوبی غیر ملفوظی کو شمار نہیں کیا جاتا ہے۔ دوسری قسم یعنی ملفوظی غیر مکتوبی کا شمار کیا جاتا ہے۔ جو الفاظ بطورِ مثال پیش کیے گئے ہیں اُن میں دونوں طرح کے حروف موجود ہیں جیسے لفظ ''مثلاً''۔ اس لفظ کا تلفّظ ''مَث لَن'' ہے۔ اس میں حرف ''ن'' ملفوظی غیر مکتوبی ہے۔ اس کا شمار تقطیع میں کیا جائے گا۔ اس کے بالکل برعکس لفظ ''بالکل'' کا تلفّظ ''بِل کُل'' ہے۔ اس میں حرف ''ا'' مکتوبی غیر ملفوظی ہے۔ اس لئے تقطیع کرنے میں اس حرف کا شمار نہیں کیا جائے گا۔

ایسے تمام الفاظ جن میں نون غنّہ اور ہائے مخلوط میں سے کوئی حرف ہو تو اُنھیں تقطیع کرنے میں شمار نہیں کیا جانا چاہیے کیوں کہ ان تمام حروف کی اپنی الگ آواز نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ اپنے سے پہلے آنے والی آوازوں کو واضح کرتے ہیں جیسے لفظ ''چاند'' میں ''ن'' کی آواز صرف غنائیت پیدا کر رہی ہے ورنہ یہ اپنی ادائیگی کے لحاظ سے ''چاد'' کے برابر ہے۔ اسی طرح ہاتھ، پھل اور سکھی میں ہائے مخلوط یعنی دو چشمی ہ (ھ) کی آواز الگ نہیں ہے بلکہ وہ اپنے سے پہلے آنے والی آواز کے ساتھ پوری طرح ضم ہو گئی ہے۔ دراصل تھ، پھ اور کھ ایک ہی آواز کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ الفاظ وزن میں ت، پ اور ک کے برابر ہوں گے۔ ان کا وزن کرنے میں انہیں ہات، پَل اور سَکی پڑھا جائے گا۔

پیاس اور کیا (سوالیہ) جیسے الفاظ میں یائے مخلوط نون غنّہ ہی کی طرح ہیں۔ یہ اپنے سے پہلے آنے والی آوازوں کو واضح تو کرتے ہیں مگر الگ سے ان کی کوئی آواز نہیں ہے لہٰذا تقطیع کرنے میں ان کی یائے مخلوط کا شمار نہیں کیا جاتا ہے یعنی یہ الفاظ ''پاس'' اور ''کا'' کے برابر شمار کیے جائیں گے مگر رنگ، پتنگ، بندگی، بندہ، سنگ، ٹھنڈا، رنج، گندا، ہنسی، سنسنی جیسے الفاظ میں نون غنّہ کی آوازیں دوسری آوازوں میں ضم نہیں ہوئی ہیں۔ان کا وجود برقرار ہے مگر یہ پوری طرح ''ن'' کی آوازیں بھی نہیں ہیں یعنی ان الفاظ کی آوازیں ''نون'' اور ''نون غنّہ'' سے مختلف ہیں۔اس لئے تقطیع کرتے وقت ان الفاظ میں ''ن'' کی آوازوں کو شمار کیا جائے گا۔الفاظ کی جن آوازوں کو تقطیع میں شمار نہیں کیا جاتا ہے وہ مندرج ہیں :

﴿۱﴾ جب دو چشمی ہ (ھ) لفظ کے بیچ یا آخر میں ہو جیسے مچھندر، دودھ، پڑھنا، لکھنا، سکھانا وغیرہ۔

﴿۲﴾ نون غنّہ چاہے وہ لفظ کے آخر میں ہو یا بیچ میں ہو۔

﴿۳﴾ وہ ''و'' جو پڑھنے میں نہیں آتا ہے جیسے خوش، خواب وغیرہ۔

﴿۴﴾ یائے مخلوط جیسے کیا، کیوں وغیرہ۔

﴿۵﴾ اگر تین ساکن حروف ایک ساتھ آجائیں تو آخری ساکن حرف تقطیع میں نظرانداز ہو سکتا ہے جیسے زیست کی ت، کارڈ کی ڈ، فارس کی س۔

﴿۶﴾ مصرع کے آخر میں جو ساکن حرف اکیلا بچ رہے اُسے عام طور پر تقطیع کرنے میں نظرانداز کر دیتے ہیں۔
جیسے ''گُلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج'' کا آخری لفظ ''آج'' ہے جس کی ''ج'' ساکن ہے اور اکیلی بچ گئی ہے۔تقطیع کرنے میں اس ''ج'' کو نظرانداز کر دیا جائے گا۔

آپ ہوں یا ہم وزن اور بحر کی بنیادی معلومات کے بغیر کسی شعر کی تقطیع نہیں کر سکتے ہیں۔ چار مصرعوں کی کوئی نظم جس کی ظاہری ہیئت رباعی جیسی ہو، ضروری نہیں کہ وہ رباعی ہو۔اگر اس نظم کے چاروں مصرعے بحرِ ہزج میں ہیں تو وہ رباعی ہوگی ورنہ نہیں۔اس لئے وزن اور بحر سے واقفیت ہونا ضروری ہے۔

وزن کے اصطلاحی معنی دو کلموں کی حرکات وسکنات کا برابر ہونا ہے۔اگر حرکات اور حروف کا اختلاف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے مثلاً لفظ ''احسان'' اور ''صندوق'' ہم وزن ہیں۔ جتنے حرکات وسکون لفظ ''احسان'' میں ہیں اُتنے ہی حرکات وسکون لفظ ''صندوق'' میں بھی ہیں۔اگر چہ دونوں کی حرکتیں مختلف ہیں۔احسان کے متحرک حروف ''ا'' اور ''س'' ہیں۔صندوق کے متحرک حروف ''ص'' اور ''د'' ہیں۔اسی طرح احسان کے ساکن حروف ح، ا، ن ہیں۔صندوق کے ساکن حروف ن، و، ق ہیں۔

رباعی کے کسی مصرع، شعر یا پوری رباعی کا وزن اور اُس کی تقطیع کرنے کا ایک نہایت آسان طریقہ یہ ہے کہ رباعی کے ہر مصرع کا پہلا رکن مفعولن یا مفعول ہوتا ہے اور آخری رکن میں فعل، فاع یا فع ضرور آئے گا۔مصرع کے درمیان باقی دیگر اوزان مفاعلن، مفاعیل، مفاعیلن، فعول اور فاعلن میں سے کوئی دو آئیں گے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رباعی کا وزن صرف ''لاحول ولاقوۃ اِلاّ باللہ'' ہے جو قطعی غلط ہے۔ہاں! یہ رباعی کا ایک وزن ضرور ہے۔رباعی کے مصرعے اس وزن پر بھی نظم کیے جا سکتے ہیں۔

﴿۱﴾ **تقطیع و بحر:** کسی شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کو تقطیع کہتے ہیں۔ تقطیع کرنے کے لئے ساکن کے مقابل ساکن اور متحرک کے مقابل متحرک حروف کا ہونا لازمی ہے۔ بحر اُن چند کلمات کا نام ہے جن پر شعر کے وزن کو پرکھتے ہیں۔ اشعار کا وزن کرنے کے لئے چند طرح کے الفاظ مقرر کیے گئے ہیں جنہیں ارکان کہتے ہیں۔ بحر جن اجزاء یا ٹکڑوں سے مل کر بنتی ہیں اُن کو ارکان یا افاعیل یا امثال کہتے ہیں اور ہر جز کو ''رکن'' کہا جاتا ہے۔ شعر میں موسیقی اور ترنّم جس قدر رہوگا بحر اُتنی ہی عمدہ ہوگی۔ بہت سی بحریں ایسی ہیں جو موسیقی اور ترنّم سے معرّا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی بحریں زیادہ رائج اور مقبول نہیں ہوسکی ہیں۔

﴿۲﴾ **زحاف:** ارکانِ بحر میں ہونے والے تغیرات کو زحاف کہتے ہیں اور ان تغیرات سے حاصل شدہ شکل کو مزاحف کہا جاتا ہے۔ یہ تغیرات تین طرح کے ہوتے ہیں۔

﴿اول﴾ کسی رکن کا کوئی جُزکم کردینا ﴿دوم﴾ کسی رکن میں اضافہ کیا جانا ﴿سوم﴾ کسی حرفِ متحرک کو ساکن کیا جانا

دراصل شعری بحریں جس حالت میں دائروں سے برآمد ہوتی ہیں ہمیشہ اُسی حالت میں استعمال نہیں کی جاتی ہیں بلکہ اکثر اُن کے ارکان میں کاٹ چھانٹ کردی جاتی ہے۔ کچھ بحریں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ جنہیں کاٹ چھانٹ کے بغیر سالم ارکان کے ساتھ استعمال ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے وہ بحریں جن کے آخر میں رکن مفعولاتُ آتا ہے۔ ایسے لفظ کو متحرک الآخر کہتے ہیں۔ اُردو کا کوئی لفظ متحرک الآخر نہیں ہوتا ہے یعنی کوئی بھی لفظ آخر میں متحرک نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے اُردو کا کوئی مصرع متحرک الآخر نہیں ہوسکتا۔

زحاف مفرد بھی ہوتے ہیں اور مرکّب بھی یعنی کسی رکن میں کوئی ایک تغیر ہوتا ہے اور کبھی بیک وقت ایک سے زیادہ تغیرات ہوتے ہیں۔ اگر کسی رکن میں ایک تغیر ہوتا ہے تو اُسے مفرد زحاف کہتے ہیں۔ اگر کسی رکن میں بیک وقت ایک سے زیادہ تغیرات ہوتے ہیں تو اُسے مرکّب زحاف کہتے ہیں۔ مرکّب زحاف کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ یہ ارکانِ سالم کے مختلف اجزا پر اپنا عمل ایک ساتھ کرتے ہیں یعنی مرکّب زحاف جن دو یا دو سے زیادہ مفرد زحافات سے مل کر بنا ہے وہ یکے بعد دیگرے اپنا عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ سالم رکن پر ایک ساتھ اُن کا عمل ہوتا ہے۔

تسکین اور تخنیق دو ایسے زحاف ہیں جو دیگر زحافوں سے اس اعتبار سے قدرے مختلف ہیں کہ یہ کبھی سالم ارکان پر عمل نہیں کرتے ہیں بلکہ اُن کا عمل ہمیشہ مزاحف ارکان پر ہی ہوتا ہے۔ صرف یہی دو ایسے زحاف ہیں جو مزاحف رکن پر اپنا عمل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی زحاف مزاحف رکن پر نہیں لگایا جاسکتا۔

رباعی کے روایتی چوبیس اوزان میں نَو زحافات کا استعمال کیا جاتا ہے جو مندرج ہیں:

﴿۱﴾ خرب ﴿۲﴾ خرم ﴿۳﴾ کفّ ﴿۴﴾ قبض ﴿۵﴾ ہتم
﴿۶﴾ جبّ ﴿۷﴾ بتر ﴿۸﴾ شتر ﴿۹﴾ زلل

مندرجہ بالا زحافات کی تفصیل اُن کے معانی و مفاہیم کے ساتھ مندرج ہے:

﴿۱﴾ **خرب:** اس کے لغوی معنی دونوں کان چھیدنا یا دونوں طرف خرابی ہے۔ اجتماعِ خرم اور کفّ کو خرب کہتے ہیں۔

﴿۲﴾ **خرم:** اس کے لغوی معنی ناک چھیدنا ہے۔ مفاعیلن کی ''م'' خرم کے عمل سے گرائے جانے کو خرم کہتے ہیں۔

﴿۳﴾ کفّ: اس کے لغوی معنی کپڑے پر کپڑا رکھ کر سینا اور رُک جانا ہے۔ اگر رکن میں سبب خفیف سے ساتواں حرف گرا دیا جائے تو اس عمل کو کفّ کہتے ہیں۔

﴿۴﴾ قبض: اس کے لغوی معنی پنجے سے پکڑنا اور گرفتگی برخلافِ بسیط کے ہیں۔ اگر رکن سے سبب خفیف سے پانچواں حرف ساقط کر دیا جائے تو اس عمل کو قبض کہتے ہیں۔

﴿۵﴾ ہتم: اگر کسی رکن کے آخر میں دو اسبابِ خفیف ہوں تو آخری سببِ خفیف اور اُس سے پہلے کے سببِ خفیف کے حرف ساکن کو گرانا اور اُس کے ماقبل متحرک کو ساکن کرنا ہتم کہلاتا ہے یعنی حذف اور قصر کے اجتماع کو ہتم کہتے ہیں۔

﴿۶﴾ جبّ: اگر کسی رکن کے آخر میں دو اسبابِ خفیف ہوں تو ان دونوں کو ایک ساتھ گرانا جبّ کہلاتا ہے۔

﴿۷﴾ بتر: حذف اور قطع کے اجتماع کو بتر کہتے ہیں۔

﴿۸﴾ شتر: اس کے لغوی معنی اوپر کی پلکوں کا پھیرنا ہے۔ مفاعیلن سے ''م'' اور ''ی'' کو ساقط کر دینے یعنی اجتماعِ خرم و قبض کو شطر کہتے ہیں۔

﴿۹﴾ زلل: خرم اور ہفتم کے اجتماع کو زلل کہتے ہیں۔

مندرجہ بالا بیان کیے گئے نو زحافات اور اُن کے ارکان مندرج ہیں :

﴿۱﴾خرب	مفعول	﴿۲﴾خرم	مفعولن	﴿۳﴾کفّ	مفاعیل
﴿۴﴾قبض	مفاعلن	﴿۵﴾ہتم	فعول	﴿۶﴾جبّ	فعل
﴿۷﴾بتر	فع	﴿۸﴾شتر	فاعلن	﴿۹﴾زلل	فاع

02.07 خلاصہ

رباعی اُس صنف سخن کو کہتے ہیں جس کے چاروں مصرعوں میں مکمّل مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ رباعی کا وزن مخصوص ہے۔ اس کے پہلے، دوسرے اور تیسرے مصرعے میں قافیہ ہوتا ہے۔ اگر تیسرے مصرعے میں بھی قافیہ لایا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ چار مصرعوں کی کوئی نظم جس کی ظاہری ہیئت رباعی جیسی ہو، ضروری نہیں کہ وہ رباعی ہو۔ اگر اس نظم کے چاروں مصرعے بحرِ ہزج میں ہیں تو وہ رباعی ہوگی ورنہ نہیں۔ جس رباعی کے تیسرے مصرع میں قافیہ نہیں ہوتا ہے اُسے رباعی خصّی کہا جاتا ہے اور جس رباعی کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں اُسے رباعی غیر خصّی کہتے ہیں۔ خصّی رباعی کو غیر مصرّع یا ناقص اور غیر خصّی رباعی کو مصرع بھی کہا جاتا ہے۔

روایتی عَروض کے مطابق رباعی کے چوبیس اوزان مقرر ہیں جو بحر ہزج سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ان چوبیس اوزان میں سے بارہ اوزان ''شجرۂ اخرب'' میں داخل ہیں اور بارہ اوزان ''شجرۂ اخرم'' میں داخل ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ رباعی کے چاروں مصرعے چوبیس میں سے کسی ایک ہی وزن میں ہوں۔ دونوں شجروں کے اوزان کو ایک دوسرے سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ بعض عروض داں نے رباعی کے بارہ اور اوزان دریافت کیے ہیں جو رباعی کے روایتی اور مخصوص چوبیس اوزان کے علاوہ ہیں۔

عروض ایک فن کا نام ہے جس کے ذریعہ اشعار کا وزن معلوم کیا جاتا ہے۔عروض کا موجد خلیل ابنِ احمد ہے جسے مکّی کہا جاتا ہے مگر جدید تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ خلیل ابن احمد مکّی نہیں بلکہ ایرانی تھا۔شاعری اور عروض کا تعلّق صوتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔اس لئے وزن کا تعلّق تلفّظ ہی سے ہوتا ہے نہ کہ تحریر یا رسم خط سے۔جو حروف تحریر میں تو ہوتے ہیں مگر اُن کا تلفّظ نہیں کیا جاتا ہے اُنہیں مکتوبی غیر ملفوظی کہتے ہیں۔اس کے برعکس جو آوازیں تلفّظ میں تو شامل کر لی جاتی ہیں مگر تحریر میں نہیں ہوتی ہیں اُنہیں ملفوظی غیر مکتوبی کہا جاتا ہے۔

وزن کے اصطلاحی معنی دو کلموں کی حرکات وسکنات کا برابر ہونا ہے۔اگر حرکات اور حروف کا اختلاف ہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔رباعی کے وزن کی تقطیع کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ رباعی کے ہر مصرع کا پہلا رکن مفعولن یا مفعول ہوتا ہے اور آخری رکن میں فعل، فاع یا فع ضرور آئے گا۔مصرع کے درمیان باقی دیگر اوزان مفاعلن، مفاعیل، مفاعیلن، فعول اور فاعلن میں سے کوئی دو آئیں گے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ رباعی کا وزن صرف ''لاحول ولاقوۃ الاّ باللہ'' ہے جو قطعی غلط ہے۔ہاں! یہ رباعی کا ایک وزن ضرور ہے۔کسی شعر کے اجزا کو بحر کے ارکان پر وزن کرنے کو تقطیع کہتے ہیں۔تقطیع کرنے کے لئے ساکن کے مقابل ساکن اور متحرک کے مقابل متحرک حروف کا ہونا لازمی ہے۔بحر اُن چند کلمات کا نام ہے جن پر شعر کے وزن کو پرکھتے ہیں۔اشعار کا وزن کرنے کے لئے چند طرح کے الفاظ مقرر کیے گئے ہیں جنہیں ارکان کہتے ہیں۔ارکانِ بحر میں ہونے والے تغیرات کو زحاف کہتے ہیں اور ان تغیرات سے حاصل شدہ شکل کو مزاحف کہا جاتا ہے۔یہ تغیرات تین طرح کے ہوتے ہیں۔کسی رکن کا کوئی جُزکم کر دینا، کسی رکن میں اضافہ کیا جانا اور کسی حرفِ متحرک کو ساکن کیا جانا۔زحاف مفرد بھی ہوتے ہیں اور مرکّب بھی۔اگر کسی رکن میں ایک تغیر ہوتا ہے تو اُسے مفرد زحاف کہتے ہیں۔اگر کسی رکن میں بیک وقت ایک سے زیادہ تغیرات ہوتے ہیں تو اُسے مرکّب زحاف کہتے ہیں۔رباعی کے روایتی چوبیس اوزان میں نَو زحافات کا استعمال کیا جاتا ہے جن کے نام خرب،خرم، کفّ،قبض،ہتم،جبّ، بتر،شتر اور زلل ہیں۔

02.08 فرہنگ

اتّحاد : یگانگت، ملاپ، میل جول، موافقت

اجتماع : مجمع، جمع ہونا

اجزا : جُز کی جمع، حصّے، ٹکڑے

اختلاف : ناموافقت کرنا، خلاف ہونا

اِدبار : بدنصیبی، بداقبالی، تنزّلی، افلاس

اِرم : شدّاد کی بنائی ہوئی بہشت کا نام

اساتذہ : اُستاذ کی جمع، کاملانِ فن

اُستاذالشعرا : شاعروں کا اُستاد

اشتراک : شرکت، ساجھا

شبِ قدر رلیلۃ القدر : مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ایک نہایت متبرّک رات۔اس کے تعیّن میں اختلاف ہے۔عموماً رمضان کے مہینے کی ستّائیسویں شب کو شبِ قدر کہا جاتا ہے

شبنمستاں : اوس کے اکھٹّا ہونے کا مقام، شبنم کی دنیا

شجرہ : نسب نامہ۔وہ نقشہ جس میں ایک ہی قبیل کے ناموں کا اندراج ہو

شمار کرنا : گنتی میں لانا، حساب میں لانا

صَوتی : صَوت سے متعلّق، آواز سے متعلّق

اصطلاح	: کسی لفظ کے لغوی یا عام معنی کے علاوہ کوئی خاص مفہوم مقرّر کر لینا
اصناف	: صنف کی جمع
اضافہ ہونا	: زیادہ ہونا، بڑھنا، بڑھوتری ہونا، ترقّی ہونا
اضداد	: ضد کی جمع، ضدیں، متضاد چیزیں
اِملا	: رسم خط
انکھڑی	: آنکھ، چتون
انگڑائی لینا	: ہاتھوں کو اوپر کر کے جسم کے بالائی حصّہ میں تناؤ پیدا کرنا
اوزان	: وزن کی جمع
باہم	: یکجا، ساتھ ساتھ، آپس میں
برآمد ہونا	: حاصل ہونا، پانا
بنیادی	: اصلی، حقیقی
بیک وقت	: ایک ہی وقت میں
پالینا	: حاصل کر لینا
پرکھنا	: شناخت کرنا، پہچاننا، جانچنا
تخیّل	: قیاس، تصوّر، خیال
تغیّرات	: تغیّر کی جمع، تبدیلیاں
تقطیع کرنا	: شعر کے اجزا کو بحر کے اوزان پر وزن کرنا
تلفّظ	: لفظ کا منہ سے ادا کرنا
جُز	: جُزو کا مخفّف، حصّہ، ٹکڑا، پارہ
جگمگ جگمگ	: چمک دمک، تیز روشنی، پُر رونق
جلالی	: قہاری کی صفت
جمالی	: رحمت کی صفت
جوتنا	: ہل چلانا، کاشت کرنا
چٹیل میداں	: وہ میدان جہاں کوئی سایہ دار درخت نہ ہو
صورت	: طریقہ، ڈھنگ، طور
ضم ہو جانا	: شامل ہو جانا، مل جانا
طرح	: حالت
طلسم ٹوٹنا	: فریب ختم ہونا، کسی اثر کا زائل ہونا
ظاہری ہیئت	: نمایاں صورت، ایسی بناوٹ جو پوشیدہ نہ ہو
عالی	: عظیم، بلند مرتبہ
عَروض داں	: ماہرِ علمِ عَروض
غنائیت	: نغمگی، موسیقیت، نغمہ کی کیفیت
غیر مکتوبی	: جو لکھا نہ گیا ہو، جو تحریر میں نہ لایا گیا ہو
غیر ملفوظی	: جو کہا نہ گیا ہو، جو بولا نہ گیا ہو
فنّی	: جس کا تعلّق فن سے ہو، فن سے متعلّق
قامت	: جسم، بدن
قدرے	: کسی قدر، تھوڑا، قلیل
قرأت	: تلفّظ
قوسِ قُزح	: دھنک، وہ سات رنگوں کی کمان جو اکثر برسات کے موسم میں آسمان پر دکھائی دیتی ہے
کاٹنا	: گزارنا، بسر کرنا، گنوانا
کسوٹی	: وہ پتھر جس پر سونے کا کس دیکھتے ہیں۔ وہ چیز جس سے کسی چیز کو پرکھا یا جانچا جائے
کلمات	: کلمہ کی جمع، الفاظ، باتیں
کون	: عالَم، دنیا، موجودات
گردِباد	: ہَوا جس میں غبار ملا ہوا ہو، پھرنے والی ہَوا
گردش	: تغیّر، بدنصیبی، بداقبالی، مصیبت، آفت
گزری	: کٹ گئی، بیت گئی، ختم ہو گئی
گیرائی	: گرفتگی، پکڑ
متحرّک	: وہ حرف جس پر حرکت یعنی زبر، زیر یا پیش ہو

حاصل کرنا	: حاصل کرنا
حذف کرنا	: الگ کرنا،ختم کردینا،کسی لفظ سے کسی حرف یا کسی عبارت سے کسی لفظ کو گرادینا یا نکال دینا
دارومدار ہونا	: انحصار ہونا
دائرہ	: حلقہ،گھیرا،احاطہ
دریافت کرنا	: معلوم کرنا، پتہ لگانا
دِوالی/دیپاولی	: ہندوؤں کے ایک تیوہار کا نام جس میں دولت کی دیوی لکشمی کی پوجا کی جاتی ہے
دہقاں	: کسان،کاشت کار
ذہن نشین کرنا	: ذہن میں رکھنا، ہمیشہ طرح یاد رکھنا
رسمِ خط	: طرزِ تحریر
رُکن	: حصّہ،ضروری حصّہ
روایتی	: روایت سے متعلّق،جس کا تعلّق رسم سے ہو
سافِل	: ادنیٰ،کم رتبہ والا، مفلس،غریب
ساکن	: وہ حرف جس پر جزم ہو،ٹھہرا ہوا، بے حرکت
سالم	: ثابت، پورا،مکمّل
سبزہ	: روئیدگی،نباتات،شادابی
سرگم	: ایک راگ کا سُر،راگ کے ساتوں سُر
سروکار	: تعلّق،واسطہ،غرض،مطلب
سکنات	: سکتہ کی جمع،وقفے،سکون،ٹھہراؤ
سُہانی	: اچھّی،عمدہ،بہترین،دل چسپ،دل پسند
متحرّک الآخر	: ایسا لفظ جس کے آخر میں حرکت ہو
مخمور	: مست،مدہوش،نشہ میں چور
مرکّب	: ملا ہوا،مخلوط،ترکیب دیا ہوا
مشتمل ہونا	: شامل ہونا،شریک ہونا
معنوی	: معنی سے منسوب،حقیقی
مفرد	: تنہا،اکیلا،علاحدہ
مقبول ترین	: جسے بہت زیادہ قبول یا پسند کیا گیا ہو
مقرّر ہونا	: متعیّن ہونا،ٹھہرایا جانا
مقفّٰی	: قافیہ کیا گیا،قافیہ دار
مکتوبی	: مکتوب سے متعلّق،لکھا ہوا
ملفوظی	: ملفوظ سے متعلّق،کہا ہوا،بولا ہو
منسلک	: شامل،مشمولہ،پرویا ہوا،نتھی کیا ہوا
موجد	: ایجاد کرنے والا،بانی،بنانے والا
موسیقی	: گانے بجانے کا علم،راگ کا علم
ناقص	: غیر مکمّل،ادھورا یا ادھوری
نشاں	: آثار،علامت
نظرانداز کرنا	: چشم پوشی کرنا،نظر میں نہ لانا
نگاہ ڈالنا	: دیکھنا
نمائندگی کرنا	: قائم مقامی کرنا،کسی کی جگہ پر موجود ہونا
ہیئت	: ساخت،بناوٹ،شکل،صورت
یکسانیت	: یکسانی،ایک جیسا ہونا

02.09 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ کسی ایک خصّی رباعی کو تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲ کسی ایک غیر خصّی رباعی کو قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۳ وزن کی تعریف اپنے الفاظ میں بیان کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا　بحر کسے کہتے ہیں؟ تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۲　زحاف سے کیا مُراد ہے؟ سمجھا کر لکھیے۔

سوال نمبر۳　رباعی کے بارہ نئے اوزان کیا ہیں؟ تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبرا　: رباعی کے لئے کون سی بحر مخصوص ہے؟

(الف) رجز　(ب) متدارک　(ج) ہزج　(د) مضارع

سوال نمبر۲　: بحر الفصاحت کس کی تصنیف ہے؟

(الف) نجم الغنی خاں نجمی　(ب) ڈاکٹر سلام سندیلوی　(ج) مولوی عبدالحق　(د) ڈاکٹر فرمان فتح پوری

سوال نمبر۳　: غیر خصّی رباعی کسے کہتے ہیں؟

(الف) جس کے کسی مصرع میں قافیہ نہ ہو　(ب) جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں

(ج) جس کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہو　(د) جس کا پہلا، دوسرا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہو

سوال نمبر۴　: رباعی کے روایتی چوبیس اوزان میں کتنے زحافات کا استعمال کیا جاتا ہے؟

(الف) ۳　(ب) ۵　(ج) ۷　(د) ۹

سوال نمبر۵　: خصّی رباعی کسے کہتے ہیں؟

(الف) جس کے کسی مصرع میں قافیہ نہ ہو　(ب) جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں

(ج) جس کا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہو　(د) جس کا پہلا، دوسرا اور تیسرا مصرع ہم قافیہ ہو

سوال نمبر۶　: ارکانِ بحر میں ہونے والے تغیرات کو زحاف کہتے ہیں۔ ذیل میں سے کون سا تغیر ارکانِ بحر میں نہیں ہوتا ہے؟

(الف) کسی رکن کو غائب کر دینا　(ب) کسی رکن میں اضافہ کیا جانا

(ج) کسی حرفِ متحرک کو ساکن کیا جانا　(د) کسی رکن کا کوئی جُز کم کر دینا

سوال نمبر۷　: زلل کسے کہتے ہیں؟

(الف) اجتماعِ خرم وقبض کو　(ب) خرم اور ہتم کے اجتماع کو

(ج) حذف اور قطع کے اجتماع کو　(د) حذف اور قصر کے اجتماع کو

سوال نمبر۸　: رباعی کے نئے اوزان کتنے ہیں؟

(الف) ۱۲　(ب) ۲۴　(ج) ۳۶　(د) ۴۸

سوال نمبر۹　: اُردو رباعیات کس کی تصنیف ہے؟

(الف) حامد حسن قادری　(ب) مرزا محمّد عسکری　(ج) ڈاکٹر فرمان فتح پور　(د) ڈاکٹر سلام سندیلوی

سوال نمبر۱۰ : عروض کے موجد کا نام کیا ہے؟

(الف) عمر خیام (ب) زینت الکعب (ج) خلیل ابن احمد (د) ابوولف

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) ہزج	جواب نمبر۶	: (الف) کسی رکن کو غائب کر دینا
جواب نمبر۲	: (الف) نجم الغنی خاں نجمی	جواب نمبر۷	: (ب) خرم اور ہتم کے اجتماع کو
جواب نمبر۳	: (ب) جس کے چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں	جواب نمبر۸	: (الف) ۱۲
جواب نمبر۴	: (د) ۹	جواب نمبر۹	: (د) ڈاکٹر سلام سندیلوی
جواب نمبر۵	: (د) جس کا پہلا، دوسرا اور تیسرا مصرعہ ہم قافیہ ہو	جواب نمبر۱۰	: (ج) خلیل ابن احمد

02.10 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اردو رباعیات از ڈاکٹر سلام سندیلوی

۲۔ اردو شاعری کا فنّی اِرتقا از ڈاکٹر فرمان فتح پوری

۳۔ بحر الفصاحت از نجم الغنی خاں نجمی

۴۔ معراج العروض از ڈاکٹر عارف حسن خاں

اکائی 03 میر ببر علی انیسؔ (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

03.01 : اغراض و مقاصد

03.02 : تمہید

03.03 : میر ببر علی انیسؔ کے حالاتِ زندگی

03.04 : میر ببر علی انیسؔ بحیثیت رباعی گو

03.05 : رباعیاتِ انیسؔ (اقتباس)

03.06 : رباعیاتِ انیسؔ (تشریح)

03.07 : میر ببر علی انیسؔ کی منتخب دیگر رباعیاں

03.08 : خلاصہ

03.09 : فرہنگ

03.10 : سوالات

03.11 : حوالہ جاتی کتب

03.01 اغراض و مقاصد

اس اکائی کا مقصد آپ کو میر ببر علی انیسؔ کی رباعیات سے واقف کرانا ہے۔ میر انیسؔ کا شمار اُردو کے ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اُنہوں نے مذہب و اخلاق اور دنیا کی بے ثباتی کے موضوعات پر بہترین رباعیاں کہی ہیں۔ اس سلسلہ میں اُن کی زندگی کے اہم گوشوں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اُن کی غزل گوئی سے قطعِ نظر مرثیہ نگاری کا بھی مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے تاکہ آپ اُن کی زندگی کے اہم گوشوں، اُن کی شخصیت اور اُن کی دیگر تخلیقات کی روشنی میں اُن کی رباعیات کے معانی و مفاہیم تک آسانی سے پہنچ سکیں۔

اس اکائی میں شامل میر انیسؔ کی دس رباعیوں کے تفصیلی مطالعہ سے نہ صرف آپ میر انیسؔ کی زبان دانی سے واقف ہوسکیں گے بلکہ آپ کی زبان فہمی میں بھی اضافہ ہوگا اور آپ کسی قدر رباعی کے فن اور موضوعات سے بھی واقف ہو جائیں گے۔

03.02 تمہید

میر ببر علی انیسؔ کا شعری سرمایہ خواہ وہ مراثی ہوں یا سلام یا رباعیات نہایت اہم اور قابلِ قدر ہے۔ کسی شاعر کے کلام کی صحیح تفہیم کے لئے اُس کی زندگی کے اہم پہلوؤں، اُس کے عہد و ماحول اور اُس کی دیگر تخلیقات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ آپ اسی لئے اس اکائی میں میر انیسؔ کی رباعیوں کے ساتھ اُن کے حالاتِ زندگی اور ان کی مرثیہ گوئی کا بھی مطالعہ کریں گے۔

آپ کے نصاب میں تفصیلی مطالعہ کے لئے میر انیسؔ کی دس رباعیوں کو شامل کیا گیا ہے جن کے موضوعات بھی کسی حد تک مختلف ہیں۔شاملِ نصاب رباعیوں کے معانی ومفاہیم بھی تحریر کیے گئے ہیں اوراُن کی رباعیوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔اس اکائی کے ایک حصّہ میں میر انیسؔ کی چند منتخب رباعیاں بھی تحریر کی گئی ہیں تا کہ آپ اُن کی رباعیات اوراُن کے رباعی گوئی کے فن سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں۔ اگر آپ میر انیسؔ کی رباعیوں اوراُن کی دیگر تخلیقات کا مطالعہ دل لگا کر کریں گے تو اُمّید ہے کہ شاملِ نصاب رباعیوں کے علاوہ اُن کی دیگر رباعیوں اوراُردو کے دوسرے شعرا کی رباعیوں کے معانی ومفاہیم بھی آسانی سے سمجھ سکیں گے۔

مراثی ہوں یا رباعیات میر انیسؔ کو دونوں اصنافِ سخن پر عبور حاصل تھا مگر اُنہوں نے مراثی کے مقابلے رباعی گوئی کی طرف توجّہ کم دی ہے۔جب اُنہیں مراثی کہنے سے کچھ فراغت حاصل ہوتی تھی تو وہ رباعیاں نظم کر لیتے تھے۔بالکل اسی طرح اُردو کے نقاد، محققین اور ادبا نے بھی جس قدر میر انیسؔ کے مراثی سے متعلّق کتابوں کا انبار لگا دیا ہے اُس کی بہ نسبت اُن کی رباعی گوئی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔اس لئے ضرورت ہے کہ انیسؔ کی رباعیوں پر بھی خاطر خواہ توجّہ دی جائے۔انیسؔ کی رباعیوں کے بغیر انیسؔ فہمی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔اسی لئے آپ کے نصاب میں اُن کی رباعیات کو شامل کر کے انیسؔ کی رباعی گوئی کے تفصیلی مطالعہ کے لئے راہ ہموار کی گئی ہے۔

03.03 میر ببر علی انیسؔ کے حالاتِ زندگی

ہندوستان کی ادبی اور تہذیبی روایت میں میر ببر علی انیسؔ کی حیثیت انتہائی منفرد ہے۔اگر چہ اُنہوں نے ابتدا میں غزلیں کہیں مگر وہ جلد ہی اس کوچہ سے نکل آئے اور پوری طرح مرثیہ گوئی کی طرف متوجّہ ہو گئے۔اُنہوں نے سلام بھی لکھے ہیں اور رباعیاں بھی کہی ہیں۔اگر وہ اور کچھ نہ لکھتے صرف رباعیاں ہی کہتے تو وہ اس صنف سخن کے اہم ترین شعرا کی صف میں شریک ہونے کے مستحق تھے۔چوں کہ اُنہوں نے بہت جلد غزل گوئی ترک کر دی۔اس لئے وہ اس صنف سخن میں کوئی خاص کارنامہ انجام نہ دے سکے۔دراصل اُن کی عظمت کی شان اُن کے مرثیے ہی ہیں۔اُنہوں نے سلام اور رباعیوں میں بھی اپنی طبع کے خوب خوب جوہر دکھائے ہیں۔میر انیسؔ کی شاعری میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو ایک عظیم فن کار کے لئے ضروری ہیں۔اُن کی شخصیت ماہرِ نفسیات، سماجی مبصّر، مصورِ کائنات، معلّمِ اخلاق، شاعر اور ڈرامہ نگار کے اوصاف کا مجموعہ تھی۔اگر چہ اُنہوں نے باضابطہ طور پر کوئی رزمیہ تخلیق نہیں کی ہے لیکن اُن کے یہاں سماجی زندگی اور انسانی رشتوں کا جو شعور پایا جاتا ہے اُس کی مثال ہمیں اپنی ادبی روایت میں ملنا بہت مشکل ہے۔

مرثیہ جسے ادب میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔اس صنف سے متعلّق ایک کہاوت ''بگڑا شاعر مرثیہ گو، بگڑا گویّا سوزخواں'' مشہور تھی مگر انیسؔ نے اس غیر اہم صنف سخن کو نہ صرف فن کے اعلیٰ ترین جوہروں سے آراستہ کر دیا بلکہ اُسے اس قدر بلندی پر بھی پہنچا دیا کہ وہ دنیا کے اعلیٰ ادب کی صف میں جگہ پانے کی مستحق ہو گئی۔میر انیسؔ کا کلام پانچ جلدوں میں نول کشور پریس، لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔نظامی پریس، بدایوں نے اُن کے کلام کو بہ اعتبارِ عمر تین حصّوں میں شائع کیا ہے۔پہلا حصّہ بچپن یعنی ابتدائی دَور کا ہے، دوسرے حصّہ میں عہدِ جوانی کا کلام ہے اور تیسرے حصّے میں ضعیفی یعنی عمر کے آخری دَور کے کلام کو شائع کیا ہے۔اُن کا تمام کلام ۱۹۵۸ء میں پاکستان سے بھی چار جلدوں میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔اُن کی رباعیات اوراُن کے سلام کے مجموعے بھی طبع ہو چکے ہیں۔اُن کے کلام کا کچھ ایسا حصّہ اُن کے عزیز و اقارب کے پاس محفوظ ہے جو ابھی تک شائع نہیں ہو سکا ہے۔

میر ببر علی انیسؔ کی ولادت ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۴ء کے درمیان فیض آباد کے محلّہ گلاب باڑی میں ہوئی تھی۔ اُن کے والد کا نام میر مستحسن اور تخلص خلیقؔ ہے جو اپنے دَور کے نام وَر شاعر اور مرثیہ گو تھے۔ میر انیسؔ کے دونوں بھائی میر اُنس اور میر مونس بھی اچھّے شعر کہتے تھے۔ اُن کا شمار اپنے دَور کے بلند پایہ شاعر اور نام وَر مرثیہ گو میں کیا جاتا ہے لیکن میر انیسؔ کی مرثیہ گوئی کی بلندی تک اُن کی رسائی نہ ہو سکی۔

میر انیسؔ کے آباو اجداد میں سے ایک بزرگ میر امامی موسوی عہدِ شاہ جہاں میں ایران کے شہر ہرات سے ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے اور دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اُن کا شمار اپنے دَور کے علما وفضلا اور صاحبِ کمال افراد میں کیا جاتا تھا۔ اُنہیں شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں ملا تھا۔ وہ اپنی قابلت کی بدولت صد ہزاری ذات کے منصب پر فائز ہوئے۔ اُن کے فرزند کا نام میر ضاحک ہے جو دہلی میں پیدا ہوئے تھے۔ میر ضاحک اور مرزا محمّد رفیع سوداؔ کی چشمکیں اور ہجو بازیاں بہت مشہور ہیں۔ شہرۂ آفاق مثنوی سحرالبیان کے خالق میر حسن انہیں میر ضاحک کے فرزند ہیں جنھوں نے مثنوی کے علاوہ بہترین مرثیہ بھی کہے ہیں اور دیگر اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ میر انیسؔ کے والد میر خلیق انہیں میر حسن کے فرزند ہیں۔ اس طرح میر انیسؔ رشتہ میں میر حسن کے پوتے ہوئے۔ میر حسنؔ عہدِ جوانی میں اپنے والد کے ساتھ دہلی سے فیض آباد آ گئے تھے۔ ان کے سلسلۂ نسب سے واضح ہے کہ میر انیسؔ کو شاعری کا ذوق نہ صرف وراثت میں ملا تھا بلکہ اُن کی تربیت و پرورش بھی شاعرانہ ماحول میں ہوئی تھی۔

میر انیسؔ نے ابتدا میں اپنے والد سے تعلیم حاصل کی اور شاعری میں بھی اُنہیں سے اصلاح لیتے رہے۔ اُنہیں مزید تعلیم کے لئے اُس زمانے کے مشہور علما مولوی حیدر علی اور میر نجف علی کے سپرد کر دیا گیا جن سے اُنہوں نے اُردو، عربی، فارسی اور مذہبی کتابیں پڑھ کر اچھّی خاصی استعداد حاصل کر لی تھی۔ اُنہوں نے کتابی علم کے علاوہ مظاہرِ قدرت اور مناظرِ فطرت سے بھی بہت کچھ حاصل کیا تھا۔ شعرائے اُردو میں میر انیسؔ جیسا قوانینِ فطرت کا ماہر اور علم النفس کا عالم شاید ڈھونڈے سے بھی نہ مل سکے گا۔ اُنہوں نے اُردو اور فارسی کے اساتذہ کے کلام کا نہایت گہرائی اور گیرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ گھر میں اکثر علم و ادب اور شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا۔ ان سب کے ساتھ مل کر اُن کی خداداد ذہانت نے اُنہیں شاعری کے فلک الافلاک پر پہنچا دیا۔

علم و فضل اور شاعری کے اعتبار سے اتنا طویل سلسلہ اُردو میں کسی شاعر کا نہیں جو انیسؔ کا ہے۔ یہ انیسؔ اور اُن کے اجداد کے کارنامے ہیں کہ اُنہوں نے مرثیہ اور مثنوی کو نہ صرف بامِ عروج پر پہنچا دیا بلکہ ان اصناف میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں جو رہتی دنیا تک مٹ نہیں سکتے۔ اُنہیں گھوڑے کی سواری بہت پسند تھی اور وہ فنِ سپہ گری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ بنوٹ اور شمشیر زنی میں وہ بہت مشّاق تھے۔ میر انیسؔ نہایت خوددار، غیور، منکسر المزاج، اصول پسند اور وضع دار انسان تھے۔ قناعت و شرافت اُن کی سب سے اہم خوبیاں تھیں۔ اسی لئے وہ کسی کی خوشامد کرنے اور کسی کے آگے سر خم کرنے کو اپنی توہین اور ہتک تصور کرتے تھے۔

جب نواب آصف الدولہ نے فیض آباد کے بجائے لکھنؤ کو اپنا دارالحکومت قرار دیا تو اُن کی تخت نشینی کے بعد میر انیسؔ کے بزرگ فیض آباد کو خیر آباد کہہ کر لکھنؤ آ گئے مگر انیسؔ کے والد فیض آباد ہی میں رہے۔ آخری عمر میں اُن کے والد بھی انیسؔ وغیرہ کو لے کر لکھنؤ آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کا بیش تر حصّہ لکھنؤ ہی میں گزارا۔ اُن کا خیال تھا کہ اُن کے کلام کی صحیح قدر اہلِ لکھنؤ ہی کر سکتے ہیں جن کی رگ و پے میں شاعری کا ذوق سمایا ہوا ہے اور جو اچھّے شعر سے لطف اندوز ہونے کا شعور بھی رکھتے ہیں۔

جب لکھنؤ تاراج ہوا تو اُنہیں مجبوراً الٰہ آباد، بنارس، عظیم آباد (پٹنہ) اور حیدر آباد جانا پڑا۔ ان شہروں میں اُن کی بہت عزّت و تعظیم کی گئی۔ میر انیسؔ پر کبھی مَوت کا خوف طاری نہیں ہوا کیوں کہ اُنہیں پتہ تھا کہ ہر نفس کو مَوت کا مزا چکھنا ہے۔ وہ ہمیشہ مرنے کے لئے تیّار رہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی مَوت سے قبل اپنے جسدِ خاکی کو دفن کرنے کے لئے جگہ کا انتظام کر لیا تھا۔ اپنے انتقال سے تقریباً دو سال پہلے اُنہوں نے اپنے مکان کے قریب پُل گاماں کے متصل احاطۂ میر محمّد خاں میں میر فیض الدّین حُسین سے سَو روپئے میں زمین خرید لی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ دردِ سر اور تپ میں مبتلا ہو گئے۔ اُنہیں اسہال کی بھی شکایت ہو گئی تھی۔ تمام علاج کے باوجود وہ صحت یاب نہ ہو سکے۔ آخر کار ۲۹ رشوال، ۱۲۹۱ھ مطابق ۱۸۷۴ء بروز دوشنبہ بوقت مغرب انیسؔ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ مولانا سیّد بندہ نواز نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ اس کے بعد اُن کی میّت کو اُن کی خریدی ہوئی زمین میں دفن کر دیا گیا۔

میر ببر علی کا تخلص شروع میں حزیںؔ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے اسے ترک کر کے انیسؔ تخلص اختیار کر لیا۔ اُنہیں بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ لکھنؤ آنے سے قبل اُنہوں نے فیض آباد میں غزلیں کہنا شروع کر دی تھیں مگر اُن کو شہرت لکھنؤ میں حاصل ہوئی۔ مولانا محمّد حُسین آزادؔ نے میر انیسؔ کے مرثیہ لکھنے اور غزل گوئی کو ترک کرنے کے واقعہ کی روداد کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ''ابتدا میں اُنہیں بھی غزل کا شوق تھا۔ ایک موقع پر کہیں مشاعرہ میں گئے اور غزل پڑھی۔ وہاں بڑی تعریف ہوئی۔ شفیق باپ یہ خبر سُن کر دل میں باغ باغ ہوا مگر ہونہار فرزند سے پوچھا کہ کل رات کو کہاں گئے تھے؟ اُنہوں نے حال بیان کیا: غزل سُنی اور فرمایا کہ بھئی اب اس غزل کو سلام کرو اور اس شغل میں زورِ طبع کو صرف کرو جو دین و دنیا کا سرمایہ ہے۔ سعادت مند بیٹے نے اُسی دن سے ادھر سے قطعِ نظر کی۔ غزل مذکور کی طرح میں سلام لکھا۔''

میر انیسؔ جب فیض آباد سے لکھنؤ آئے اُس وقت لکھنؤ میں مرزا سلامت علی دبیرؔ اور میر مداری فنِ مرثیہ گوئی کے اُستاد تسلیم کیے جاتے تھے لیکن جب میر انیسؔ کے مراثی کا شہرہ ہوا تو دیگر باکمالوں کا آوازہ مدّھم پڑ گیا۔ میر انیسؔ نے اپنے والد کے زمانے ہی میں کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ مرثیہ گوئی کے میدان میں میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ اور مرزا دبیرؔ کے اُستاد میر مظفّر ضمیرؔ کی چشمکیں اور نوک جھونک چلتی رہتی تھیں۔ میر ضمیرؔ اور میر خلیقؔ جب اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے تو انیسؔ و دبیرؔ میں مرثیہ گوئی کی معرکہ آرائی شروع ہو گئی لیکن اس سے کسی خرابی کے بجائے دونوں شعرا کے کلام کو مزید سنورنے اور جلا ملنے کے مواقع فراہم ہوئے۔

میر انیسؔ وقت کے بہت پابند تھے۔ اُنہیں ورزش کا بھی شوق تھا۔ ورزش ہی کی وجہ سے اُن کا جسم ٹھوس اور اعضا چست اور متناسب تھے۔ اُن کا قد میانہ مائل بہ درازی تھا۔ جسم چھریرا، سینہ چوڑا، گردن صُراحی دار، چہرہ کتابی، آنکھیں بڑی بڑی اور رنگ گیہواں تھا۔ مونچھیں قدرے بڑی رکھتے تھے اور داڑھی اس قدر باریک کترواتے تھے کہ وہ قریب سے تو نظر آتی تھی مگر دور سے مُنڈی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مجموعی طور پر اُن کے چہرے کے نقش و نگار خوش نما تھے۔ وہ عام طور پر نیچا گھیر دار کُرتہ پہنتے تھے جو اس قدر لمبا چوڑا اور گھیر دار ہوتا تھا کہ اُس پر انگرکھا پہننے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔ کُرتے کی دونوں آستینیں چُنی ہوئی ہوتی تھیں جو لچھّے دار ہو کر کہنیوں تک خود بخود چڑھ جاتی تھیں۔ پیر میں گھیتلا جوتا ہوتا تھا۔ وہ کبھی چوگوشیہ اور کبھی پنج گوشہ ٹوپی پہنتے تھے جس کے ہر گوشہ میں صراحی اور کنٹھا یا چاند بنے ہوتے تھے۔ میر انیسؔ شیعہ خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ فرماں روانِ اودھ بھی شیعہ تھے۔

کہا جاتا ہے کہ مجلس میں میر انیسؔ کے پڑھنے کا انداز بالکل منفرد تھا۔ وہ جب پڑھتے تھے تو ایک سماں سا بندھ جاتا تھا۔ اُنہیں روتوں کو ہنسانے اور ہنستوں کو رُلانے میں بلا کی مہارت حاصل تھی۔ میر انیسؔ اُن چند خوش قسمت شعرا میں سے ایک ہیں جو اپنی حیات ہی میں بقائے دَوام سے ہم کنار ہو گئے۔

03.04 میر ببر علی انیسؔ بحیثیت رباعی گو

اُردو کے دیگر شعرا کی طرح میر انیسؔ نے بھی رباعی کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ اُن کی زیادہ تر توجّہ مرثیہ گوئی کی طرف رہی۔ اُنہیں جب مرثیہ گوئی سے کچھ فراغت حاصل ہوتی تو وہ سلام اور رباعیاں نظم کرتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی بیش تر رباعیاں راستوں اور مجلسوں میں کہی ہیں پھر بھی ان کی رباعیاں اعلیٰ درجہ کی ہیں جنہیں اُردو ادب کا گراں قدر سرمایہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اُن کی بیش تر رباعیاں موضوع، مواد، زبان وبیان کے اعتبار سے اپنا جواب آپ ہیں۔ خواجہ الطاف حُسین حالؔی اعلیٰ درجے کی رباعیات کی تخلیق ہی کے سبب شیخ سعدؔی اور میر انیسؔ کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ میر انیسؔ کو سرتاج الشعرا کہتے تھے۔ اُنہوں نے اپنی ایک رباعی میں میر انیسؔ کو دلّی کی زبان کا سہارا اور لکھنؤ کی آنکھ کا تارا قرار دیا ہے۔

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ — اور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیسؔ
دلّی تھی جڑ اُس کی، لکھنؤ اُس کی بہار — دونوں کا ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

میر انیسؔ کی بیش تر رباعیاں مذہب واخلاق سے متعلّق ہیں۔ اُنہوں نے کچھ رباعیاں ذاتیات پر بھی کہی ہیں۔ حمد وثنا، نعت، منقب، معتقدات اور مراثی سے متعلّق موضوعات کی رباعیات کو مذہبیات کے ضمن میں رکھا جا سکتا ہے۔ اُنہوں نے حمد وثنا سے متعلّق بیش تر رباعیوں میں اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات جیسے رزّاقی، ستّاری، غفّاری، جود وکرم، رحم وعدل وغیرہ کا ذکر اپنے خاص پیرایے میں کیا ہے البتّہ کچھ رباعیاں صوفیانہ رنگ کی بھی ہیں۔ بطورِ مثال پیش ہیں چند رباعیاں۔

دولت کی ہوس ہے نہ طمع مال کی ہے — خواہش منصب کی ہے نہ اقبال کی ہے
ہے ذات تِری جواد و غفار و غنی — اُمید تجھی سے تیرے افضال کی ہے

☆

سَر گرم رہے نہ سرد، آہیں ہیں یہی — سویا کیے، حسرت کی نگاہیں ہیں یہی
یہ جسم میں ہیں جو تین سَو ساٹھ رَگیں — گویا تِری معرفت کی راہیں ہیں یہی

☆

گوہر کو صدف میں آبرو دیتا ہے — بندے کو بغیر جستجو دیتا ہے
انسان کو رزق، گُل کو بُو، سنگ کو لعل — جو کچھ دیتا ہے جس کو، تُو دیتا ہے

انیسؔ کی متعدد رباعیاں حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فضائل، اُسوۂ حسنہ، سیرت وتعلیمات اور حضرت علی کرم اللہ وجہ کی فضیلت سے متعلق ہیں۔ ایسی رباعیوں میں واقعۂ معراج اور حضور کے معجزات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ کئی رباعیوں میں تو رسولِ خدا

اور امیرالمومنین حضرت علی کے فضائل مشترکہ طور پر نظم کیے گئے ہیں۔مندرجہ ذیل رباعیوں میں لطافتِ سخن کے ساتھ دقّتِ فکر کو بھی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ان میں مذہب اور فلسفے کا ایسا حسین امتزاج ہے جس کی مثال آسانی سے نہیں مل سکتی۔

دنیا میں محمد سا شہنشاہ نہیں — کس راز سے خالق کے وہ آگاہ نہیں؟
باریک ہے ، ذکرِ قربِ معراج انیسؔ — خاموش کہ یاں سخن کو بھی راہ نہیں

☆

شایاں تھے اُنہی کی شانِ برتر کے لئے — اعجاز یہ دو، دونوں برادر کے لئے
شق القمر و رجعتِ خورشیدِ مبیں — احمد کے لئے وہ، اور یہ حیدر کے لئے

☆

ہے چادرِ نورِ حق ردائے حیدر — خورشید ہے نقشِ کفِ پائے حیدر
کہتے ہیں دِکھا کے عرش و کُرسی کو ملک — یہ جائے محمد ہے ، وہ جائے حیدر

میر انیسؔ شیعہ تھے اور اُن کے مذہبی عقائد بھی وہی تھے جو اہلِ شیعانِ علی کے ہوتے ہیں۔وہ حضرت علی اور گیارہ اماموں کو رسولِ خدا کا جانشین سمجھتے تھے۔اُن کے نزدیک امام حُسین اور شہدائے کربلا کی شہادت کو یاد کر کے گریہ وزاری کرنا واجب اور باعثِ نجات ہے۔وہ مجلسِ عزا کی بنا اور عزاداری کو فرض سمجھتے تھے۔اُن کے مراثی، سلام اور متعدد رباعیوں سے اُن کے اعتقادات کی وضاحت ہوتی ہے۔

یکتا گہرِ قلزمِ سرمد ہے حُسین — سردارِ اُمم ، مثلِ محمد ہے حُسین
جب سَر کو قدم کیا تو سَر کی راہِ عشق — حقا کہ شہیدوں میں سرآمد ہے حُسین

☆

مجلس میں مزہ اَشک بہانے کا ہے — فردوس صلہ رونے رُلانے کا ہے
خورشید نقابِ رُخ اُٹھائے کیوں کر — ہاں وقت یہ فاطمہ کے آنے کا ہے

☆

پیدا ہوئے دُنیا میں اِسی غم کے لئے — رونا ہی جلا ہے چشمِ پُرنم کے لئے
ہم کو دو نعمتیں خدا نے دی ہیں — آنکھیں رونے کو اور ہاتھ ماتم کے لئے

☆

رومال ہے اَشکوں سے بھگونے کے لئے — یہ راتیں یہ دن نہیں ہیں سونے کے لئے
ہنسنے کے لئے تو سال بھر ہے یارو! — دس روز محرّم کے ہیں رونے کے لئے

میر انیسؔ رؤسائے دنیا کی تعریف وتوصیف کو اپنے لئے ننگ و عار سمجھتے تھے۔اُنہیں خدا، رسول اور اہلِ بیت کی مدح سرائی پر اس قدر ناز تھا کہ وہ کسی کو بھی اپنی نظر میں نہیں لاتے تھے۔اگر وہ کسی مقام پر اپنی تعریف کرتے ہیں تو اس خیال سے کرتے ہیں کہ حمدِ خدا، نعتِ رسول اور مدّاحی اہل بیت کے بدولت ہی اُنہیں یہ مرتبہ ومقام نصیب ہوا ہے۔جیسا کہ ذیل کی اس رباعی میں وہ فرماتے ہیں۔

شہرہ ہر سُو جو خوش کلامی کا ہے باعث مدحِ امامِ نامی کا ہے
مَیں کیا ؟ آواز کیسی؟ پڑھنا کیسا؟ آقا یہ شرف تیری غلامی کا ہے

میر انیسؔ کی رباعیاں اخلاقی موضوعات کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ ہر قسم کے اخلاقی مضامین نظم کرنے میں قدرت رکھتے تھے۔ اخلاق و مواعظ کے موضوعات کے سبب ہی اُن کی رباعیوں کو اعلیٰ درجہ کی رباعیاں قرار دیا جاتا ہے۔ اُن کی بیش تر رباعیاں عجز وانکسار، فقر واستغنا، غیرت وحمیّت، تواضع وخاکساری، قناعت وتوکل، صبر وتحمّل، حیاوعزّتِ نفس کے موضوعات پر مبنی ہیں۔ وہ کبروغرور، حرص طمع، نخوت وتندخوئی اور ہواوہوس جیسی بُرائیوں سے باز رہنے کی تلقین بھی کرتے ہیں۔

اِتنا نہ غرور کر کہ مَرنا ہے تجھے آرام ابھی قبر میں کرنا ہے تجھے
رکھ خاک پہ سوچ کر ذرا پاؤں انیسؔ اک روز صراط سے گزرنا ہے تجھے

☆

خُلق و تعظیم دولتِ دینی ہے ہر عیب کا عیب، عیبِ خود بینی ہے
ہوتی ہے گنہگار کی توبہ بھی قبول خالق کو پسند عجز و مسکینی ہے

☆

برباد کیا ہے طبعِ آوارہ نے تڑپا رکھا ہے قلبِ صد پارہ نے
شیطان کی نہ کچھ خطا نہ قسمت کا قصور مارا مجھے آہ نفسِ امّارہ نے

میر انیسؔ نے ذاتیات پر بھی متعدد رباعیاں کہی ہیں جن میں سے کئی رباعیاں عام شعرا کی طرح فخر وخودستائی، مصائب وآلام، حسّادو زمانہ کی شکایت، بداخلاقی وبدمذاقی اور کساد بازاری جیسے موضوعات پر مبنی ہیں۔ پیش ہیں چند رباعیاں۔

وہ نظم پڑھوں کہ بزم خوشبو ہو جائے عطر عنبر ہر ایک آنسو ہو جائے
یادآئے شمیمِ زلفِ ہم شکلِ رسول آہوں کا دُھواں حُور کا گیسوہو جائے

☆

کٹ جاتے ہیں خود رنگ بدلنے والے کب تھمتے ہیں جواَشک ہیں ڈھلنے والے
اللہ رے ترے سخن کی تاثیر انیس رو دیتے ہیں مثلِ شمع، جلنے والے

☆

کس جسم پہ بَل کروں کہ شہ زور ہوں مَیں دیکھو کہ ضعیف، صورتِ مور ہوں مَیں
تَن پر یہ پڑی ہے گردِ بازارِ کساد ہوتا ہے یقین کہ زندہ دَرگور ہوں مَیں

اس مختصر تجزیہ سے ظاہر ہے کہ انیسؔ فطری طور پر رباعیاں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن کی بیش تر رباعیات کے موضوعات مذہب واخلاق ہیں۔ اگر چہ اُنہوں نے مرثیہ کی بہ نسبت رباعی کی طرف کم توجّہ کی ہے پھر بھی اُن کی رباعیوں کا شمار اُردو کی اعلیٰ درجہ کی رباعیوں میں کیا جاتا ہے۔

03.05 رباعیاتِ انیسؔ (اقتباس)

﴿۱﴾

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے
بُلبُل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا
جس پھول کو سونگھتا ہوں، بُو تیری ہے

﴿۲﴾

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے
وہ دل میں فِروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی
جو ظرف کہ خالی ہے، صدا دیتا ہے

﴿۳﴾

دل کو آرام بے قراری سے ملا
سینے کو سُرور آہ و زَاری سے ملا
گلزارِ جہاں میں سرفرازی پائی
یہ پھل مجھے نخلِ خاکساری سے ملا

﴿۴﴾

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے
جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں
دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

﴿۵﴾

ماں باپ سے بھی سِوا ہے شفقت تیری
اَفزوں ہے تیرے غضب سے، رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جَلا
وہ رحم تیرا ہے، یہ عدالت تیری

﴿۶﴾

دل سے طاقت بدن سے کُس جاتا ہے
آتا نہیں پھر کر، جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کُھلا
یاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے

﴿۷﴾

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا
ادنٰی کے لئے مقامِ اعلٰی بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں
اِس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

﴿۸﴾

جس شخص کو عقبٰی کی طلب گاری ہے
دنیا سے ہمیشہ اُسے بے زَاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں
غافل یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے

﴿۹﴾

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — اِس باغ سے کیا کیا گُلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل، جس نے دیکھی نہ خزاں؟ — وہ کون سے گُل کھلے، جو مُرجھا نہ گئے

﴿۱۰﴾

طفلی دیکھی، شباب دیکھا ہم نے — ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کُھلا — جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

03.06 رباعیاتِ انیسؔ (تشریح)

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے — بُلبُل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا — جس پھول کو سونگھتا ہوں، بُو تیری ہے

اس رباعی میں یہ کہا گیا ہے کہ خالقِ کونین ہر جگہ موجود ہے۔ کائنات کی ہر مرئی اور غیر مرئی شے کو اے خدا تیری ہی جستجو ہے اور وہ تیری ہی حمد وثنا کرتی رہتی ہے۔ میر انیسؔ خالقِ کائنات کی اسی صفت کی وضاحت کے لئے کہتے ہیں کہ گلشن میں صبا تیری ہی جستجو میں ادھر اُدھر بھٹکتی رہتی ہے اور بُلبُل بھی تیری ہی حمد وثنا کرتی رہتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے تو ہر رنگ، ہر روپ اور ہر شکل میں تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ ہر چیز تیری قدرتِ کاملہ کا مظہر ہے۔ مَیں جس پھول کو سونگھتا ہوں اُس میں تیرے ہی وجود کی بو محسوس کرتا ہوں۔

رتبہ جسے دنیا میں خدا دیتا ہے — وہ دل میں فِروتنی کو جا دیتا ہے
کرتے ہیں تہی مغز ثنا آپ اپنی — جو ظرف کہ خالی ہے، صدا دیتا ہے

میر انیسؔ نے دوسری رباعی میں نہایت خوب صورت انداز میں عظیم ہستیوں اور اعلیٰ مرتبہ پر فائز افراد کو منکسر المزاج ہونے کا درس دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جنھیں اعلیٰ مرتبہ پر فائز کرتا ہے اور جس کے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے وہ فروتنی یعنی عجز اور انکساری سے پیش آتے ہیں۔ وہ تیسرے مصرع میں یہ بھی کہتے ہیں کہ جو تہی مغز یعنی کم ظرف ہوتے ہیں وہ اپنی ثنا، بڑائی اور تعریف خود کرتے رہتے ہیں۔ میر انیسؔ اپنی بات کی وضاحت کے لئے خالی گھڑے یا برتن کی مثال دے کر کہتے ہیں کہ جس گھڑے میں پانی کم ہوتا ہے اُس میں سے مسلسل آوازیں آتی رہتی ہیں یعنی جس طرح ادھ جل گگری جھلکتی رہتی ہے اُسی طرح کم ظرف اور تہی مغز اپنے مُنہ سے اپنی ہی بڑائی اور تعریف کرتا رہتا ہے جب کہ عظیم افراد عجز وانکساری کا مظاہرہ کرتے ہیں۔

دل کو آرام بے قراری سے ملا — سینے کو سُرور آہ و زَاری سے ملا
گلزارِ جہاں میں سرفرازی پائی — یہ پھل مجھے نخلِ خاکساری سے ملا

میر انیسؔ نے تیسری رباعی میں بھی عجز، انکساری اور خاکساری کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر انسان اپنی حیثیت و حقیقت سے واقف ہو جائے تو وہ ہر حال میں خوش رہ سکتا ہے۔ خودستائی اور اپنی تعریف کرنے والے کو کبھی سکون میسّر نہیں ہوتا جب کہ منکسر المزاج ہمیشہ شاد و خوش رہتا ہے۔ وہ اپنی مثال دے کر کہتے ہیں کہ خاکساری اور انکساری کے سبب ہی مجھے بے قراری سے سکون وقرار اور

آہ وزاری سے سکون واطمینان حاصل ہوا ہے، یہی نہیں بلکہ سرفرازی اور عزّت بھی نصیب ہوئی ہے۔ دراصل میرانیسؔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ منکسر المزاج کی زندگی سکون واطمینان سے بسر ہوتی ہے۔

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

شاملِ نصاب چوتھی رباعی میں میرانیسؔ نے نرمی وانکساری کی اہمیت کو اپنے خاص پیرایہ میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ آسمان کے مقابل زمین کی کوئی حیثیت وحقیقت نہیں ہے اور توانا کے سامنے ناتواں کی قدر نہیں کی جاتی لیکن یہ نرمی اور انکسار ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں کہ آسمان زمین کے آگے اور طاقتور ناتواں کے آگے خود بخود جھک جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ نرمی، انکساری، عاجزی اور شیریں بیانی سے سنگ دل اور بے رحم افراد بھی اُسی طرح اطاعت وفرماں برداری کرنے لگتے ہیں جس طرح زبان کے سامنے دانت صف بستہ ہیں۔ واضح ہو کہ زبان نہایت نرم، نازک اور ملائم ہوتی ہے جب کہ دانت پتھر کی طرح سخت اور مضبوط ہوتے ہیں۔ اگر دانت چاہیں تو ذرا سی دیر میں زبان کو کاٹ دیں مگر زبان کی نرمی اور انکساری ہی کی وجہ سے دانت صف بستہ ہو کر اُس کی اطاعت بھی کرتے ہیں اور حفاظت کے لئے نگہبانی بھی کرتے ہیں۔

ماں باپ سے بھی سِوا ہے شفقت تیری اَفزوں ہے تیرے غضب سے، رحمت تیری
جنت انعام کر کہ دوزخ میں جَلا وہ رحم تیرا ہے، یہ عدالت تیری

اللہ تعالیٰ رحمٰن ورحیم ہے۔ میرانیسؔ نے پانچویں رباعی میں اللہ تعالیٰ کی اسی صفت کا ذکر خوب صورت پیرایے میں کیا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ملتجیانہ انداز میں کہتے ہیں کہ اے خدائے بزرگ وبرتر تیری شفقت اور عنایت والدین یعنی ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ تو قہار بھی ہے اور رحمٰن ورحیم بھی ہے مگر تیرے غیظ وغضب پر تیری رحمت ومہربانی کو برتری حاصل ہے۔ مَیں نادم، شرمسار اور گنہگار بندہ ہوں۔ یہ تیری مرضی پر منحصر ہے کہ تو مجھے جنّت میں جگہ دے یا مجھے دوزخ میں ڈال۔ اگر تو نے میرے اعمال کا محاسبہ کیا تو مجھے دوزخ نصیب ہوگی اور اگر تو نے مجھے جنّت عطا کی تو یہ تیری رحمت اور مہربانی ہوگی۔ دراصل میرانیسؔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ اعمال کی بدولت جنّت کی طلب فضول ہے اگر اللہ تعالیٰ کرم فرما ہوگا تو وہ گناہوں کو معاف کردے گا اور جنّت بھی عطا کرے گا۔

دل سے طاقت بدن سے گَس جاتا ہے آتا نہیں پھر کر، جو نفس جاتا ہے
جب سال گرہ ہوئی تو عقدہ یہ کُھلا یاں اور گرہ سے ایک برس جاتا ہے

شاملِ نصاب چھٹویں رباعی میں میرانیسؔ نے ایک تلخ حقیقت کا ذکر کیا ہے۔ اُنہوں نے اس رباعی کے ذریعہ سال گرہ یعنی برتھ ڈے (Birthday) کی تقریب کے موقع پر خوشی اور مسرّت کا اظہار کرنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ہے کہ جو سانس ایک بار بدن سے نکل جاتی ہے وہ پھر واپس جسم میں نہیں آتی ہے یعنی ایک سانس کی عمر کم ہو جاتی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب کسی کی سال گرہ کی تقریب کا انعقاد کیا جاتا ہے تو اُس کی عمر ایک سال کم ہو جاتی ہے لیکن ایک سال عمر کے کم ہو جانے کا افسوس کرنے کے بجائے خوشی ومسرّت کا اظہار کیا جاتا ہے۔ لوگ یہ نہیں سوچتے ہیں کہ پے در پے یا عمر کے بڑھنے کے ساتھ جسم کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ اس لئے ایک سال کی مدّت پوری

ہونے پر یا سال گرہ کی تقریب کے موقع پر ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ جس کی سال گرہ کی تقریب میں خوشیوں کا اظہار کیا جا رہا ہے اُس کی عمر ایک سال اور کم ہو گئی ہے۔

آدم کو عجب خدا نے رتبہ بخشا — ادنیٰ کے لئے مقامِ اعلیٰ بخشا
عقل و ہنر و تمیز و جان و ایماں — اِس ایک کفِ خاک کو کیا کیا بخشا

ساتویں رباعی میں میر انیسؔ نے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم یعنی انسان کو بے شمار نعمتیں عطا کی ہیں۔ اُسی نے ایک کفِ پا یعنی ادنیٰ انسان کو اعلیٰ مقام و مرتبہ پر فائز کر دیا ہے۔ اُس قادرِ مطلق نے انسان کو عقل، ہنر، تمیز، جان و ایمان جیسی بے بدل اور بیش بہا نعمتوں کے ساتھ اور بھی بہت سی بے شمار صفات و خوبیوں سے نوازا ہے۔ دراصل یہ رباعی بندوں کے اظہارِ عبدیت اور خدا کی شانِ کریمی کی وضاحت کا بہترین نمونہ ہے۔ دراصل یہ رباعی انسانی وجود کی جامعیت اور عظمت کے مضمون کو بہترین پیکرِ اظہار عطا کر رہی ہے۔

جس شخص کو عقبیٰ کی طلب گاری ہے — دنیا سے ہمیشہ اُسے بے زَاری ہے
اک چشم میں کس طرح سمائیں دونوں — غافل یہ خواب ہے، وہ بیداری ہے

شاملِ نصاب آٹھویں رباعی میں میر انیسؔ نے دنیاداری سے باز رہنے اور عقبیٰ کی فکر کرنے کی تلقین کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو عقبیٰ سنوارنے کی فکر ہے وہ ہمیشہ نیک کام کرتا ہے اور اُسے دنیا کی طلب نہیں ہوتی۔ دنیا داری اور عاقبت اندیشی کو ایک ساتھ نہیں رکھا جا سکتا۔ جس طرح خواب اور بیداری ایک ساتھ آنکھوں میں نہیں سما سکتے اُسی طرح دنیا اور عقبیٰ یعنی دین اور دنیا کو ایک ساتھ نہیں سنوارا جا سکتا۔ جس طرح کھلی یا بیدار آنکھوں سے خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ اُسی طرح دنیا دار کا عقبیٰ بھی نہیں سنور سکتا۔

افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے — اِس باغ سے کیا کیا گُلِ رعنا نہ گئے
تھا کون سا نخل، جس نے دیکھی نہ خزاں؟ — وہ کون سے گل کھلے، جو مُرجھا نہ گئے

میر انیسؔ نے نویں رباعی میں دنیا کی بے ثباتی کا ذکر کیا ہے اور مثالیں دے کر سمجھایا ہے کہ اس جہانِ فانی کی ہر چیز کا مقدر فنا ہو جانا ہے۔ کوئی کتنا ہی عظیم، حسین اور بلند مرتبت ہو اُسے اس دنیا سے ایک نہ ایک روز جانا ضرور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دنیا سے بہت سے دوست رخصت ہو چکے ہیں اور اسی باغِ جہاں سے ایک سے ایک بہترین گل رعنا یعنی جو حُسن، خوبی اور خوب صورتی کا جیتا جاگتا نمونہ تھے وہ بھی وداع ہو چکے ہیں۔ اس جہانِ رنگ و بو میں ایسا کوئی نخل یا شجر نہیں ہے جو خزاں کی زد میں نہ آیا ہو۔ ہر پھول کا مقدّر مرجھانا ہے۔ اب تک جتنے بھی پھول شگفتہ ہوئے ہیں وہ مرجھائے ضرور ہیں۔ دراصل اس رباعی کے ذریعہ انیسؔ نے در پردہ یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ اس لئے راہِ راست پر چل کر چندروزہ زندگی کو گزارنا چاہیے۔

طفلی دیکھی ، شباب دیکھا ہم نے — ہستی کو حبابِ آب دیکھا ہم نے
جب آنکھ ہوئی بند تو عقدہ یہ کُھلا — جو کچھ دیکھا سو خواب دیکھا ہم نے

آپ کے نصاب میں شامل دسویں رباعی میں میر انیسؔ نے چندروزہ زندگی اور دنیا کی حقیقت کو نہایت خوب صورت پیرایے میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم بچپن کے لڑکپن سے بھی واقف ہیں اور عہدِ شباب کی سرمستیوں سے بھی لطف اندوز ہوئے ہیں اور اس حقیقت

سے بھی آگاہ ہیں کہ زندگی یا ہستی محض حبابِ آب یعنی پانی کے بُلبُلے کی طرح ہے جو چند لمحوں میں پھوٹ کر ناپائیدار ہو جاتا ہے۔ انسان کو خواہ کتنی ہی لمبی عمر حاصل ہو جائے مگر جب اُس کی آنکھ بند ہوگی یا جب اُس کی وفات ہوگی تو پتہ چلے گا کہ اب تک جو مشاہدہ کیا گیا تھا یا جو کچھ دیکھا گیا تھا وہ اُس خواب ہی کی مانند تھا جو ذرا دیر میں ٹوٹ جاتا ہے اور جس کا حقیقت واصلیت سے کوئی تعلّق نہیں ہوتا ہے۔

03.07 میر ببر علی انیسؔ کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

خلّاقِ جہاں ہے ، ربِّ اکبر تُو ہے ستّار ہے ، رزّاق ہے ، داوَر تُو ہے
حیران ہوں کیا کروں صفت مَیں تیری جو حمد و ثنا ہے، اُس سے برتر تُو ہے

﴿۲﴾

آدم کو یہ تحفہ، یہ ہدیہ نہ ملا ایسا تو کسی بشر کو پایہ نہ ملا
اللہ رے لطافت تنِ پاکِ رسول ڈھونڈا کیا آفتاب، سایہ نہ ملا

﴿۳﴾

دین داروں نے اَمن، کفر و شر سے پایا کعبے نے شرف ایسے گہر سے پایا
ہاتھوں پہ علی کو لے کے احمد نے کہا یہ دُرِّ نجف خدا کے گھر سے پایا

﴿۴﴾

وہ تخت کدھر ہیں اور کہاں تاج ہیں وہ؟ جو اَوج پہ تھے، زیرِ زمیں آج ہیں وہ
قرآں لکھ لکھ کے وقف جو کرتے تھے اک سورۂ الحمد کے محتاج ہیں وہ

﴿۵﴾

جو صاحبِ فہم ہے، وہی انساں ہے دانا کے لئے فروتنی شایاں ہے
جاہل کبھی جہل سے نہیں پھرنے کا ناداں کو اگر قلب کرو، ناداں ہے

﴿۶﴾

سایے سے بھی وحشت ہے، وہ دیوانہ ہوں جو دام سے بھاگتا ہے، وہ دانہ ہوں
دیکھا نہیں جس کو، اُس کا عاشق ہوں انیسؔ جلتا ہے جو بے شمع، وہ پروانہ ہوں

﴿۷﴾

وہ موجِ حوادث کا تھپیڑا نہ رہا کشتی وہ ہوئی غرق، وہ بیڑا نہ رہا
سارے جھگڑے تھے زندگانی کے انیسؔ جب ہم نہ رہے تو کچھ بکھیڑا نہ رہا

﴿۸﴾

کیوں زر کی ہوَس میں دَر بہ دَر پھرتا ہے جانا ہے تجھے کہاں ، کدھر پھرتا ہے؟
اللہ رے پیری میں ہوَس دنیا کی تھک جاتے ہیں جب پاؤں تو سَر پھرتا ہے

﴿۹﴾

پیری آئی عِذار بے نور ہوئے یارانِ شباب پاس سے دور ہوئے
لازم ہے کفن کی یاد ہر وقت انیسؔ! جو مُشک سے بال تھے، وہ کافور ہوئے

﴿۱۰﴾

عزت رہے یار و آشنا کے آگے محجوب نہ ہوں شاہ وگدا کے آگے
گر پاؤں چلیں تو راہِ مولا میں چلیں یہ ہاتھ جب اُٹھیں تو خدا کے آگے

﴿۱۱﴾

مَر مَر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے رُخ سب سے پھرا کے مُنہ دِکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے روؤں اے قبر! مَیں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے

﴿۱۲﴾

کس مُنہ سے کہوں، لائقِ تحسیں ہوں مَیں کیا لطف جو گُل کہے کہ رنگیں ہوں مَیں
ہوتی ہے حلاوتِ سخن خود ظاہر کہتی ہے کہیں شکر کہ شیریں ہوں مَیں

﴿۱۳﴾

افسوس زمانے کا عجب طَور ہوا کیوں چرخِ کہن! آہ نیا دَور ہوا
گردش کب تک، نکل چلو جلد انیسؔ اب یاں کی زمیں اَور، فلک اَور ہوا

﴿۱۴﴾

یہ عمر یوں ہی تمام ہو جائے گی مَرنے کی خبر بھی عام ہو جائے گی
روتے ہو انیسؔ کیا جوانی کے لئے پیری کی سحر بھی شام ہو جائے گی

﴿۱۵﴾

اَندیشۂ باطل سحر و شام کیا عقبٰی کا نہ ہائے کچھ سَر انجام کیا
ناکام چلے جہاں سے افسوس انیسؔ! کس کام کو یاں آئے تھے، کیا کام کیا

﴿۱۶﴾

انساں ہی کچھ اِس دَور میں پامال نہیں سچ ہے کوئی آسودہ و خوش حال نہیں
اندیشۂ آشیان و خوفِ صیاد مُرغانِ چمن بھی فارغ البال نہیں

﴿۱۷﴾

دنیا میں کسی کا نہ سہارا دیکھا بچنے کا نہ غم سے کوئی چارا دیکھا
کچھ بخت ہمارے ہی نہیں سرگشتہ گردش میں فلک کا بھی ستارا دیکھا

﴿۱۸﴾

دُنیا جسے کہتے ہیں، بلا خانہ ہے پامال ہے جو عاقل و فرزانہ ہے
مابینِ زمین و آسماں یوں ہم ہیں جیسے دو آسیا میں اک دانہ ہے

﴿۱۹﴾

ویراں ہے کوئی گھر، کہیں آبادی ہے راحت سے کوئی اور کوئی فریادی ہے
اک عشرت و غم کا ہے مرقع دنیا ماتم ہے کسی جا تو کہیں شادی ہے

﴿۲۰﴾

اب زیرِ لحد قدم کا باب آ پہنچا ہوشیار ہو جلد، وقتِ خواب آ پہنچا
پیری کی بھی دوپہر ڈھلی، آہ انیسؔ ہنگامِ غروبِ آفتاب آ پہنچا

03.08 خلاصہ

میر انیسؔ کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی تھی۔ اُنہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی پھر اُنہوں نے وہیں کے مشہور علما سے اُردو، فارسی، عربی اور مذہبی کتابوں کا درس لیا۔ وہ نواب آصف الدولہ کے عہد میں اپنے والد کے ساتھ لکھنؤ آ گئے تھے اور پھر اُنہوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اُردو کی شہرہ آفاق مثنوی سحر البیان کے خالق میر حسن اُن کے حقیقی دادا تھے۔ میر انیسؔ کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا۔ شروع میں اُن کا تخلص حزیںؔ تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد اُنہوں نے انیسؔ تخلص اختیار کر لیا۔ دیگر شعرا کی طرح اُنہوں نے بھی شروع میں غزلیں کہیں مگر اپنے والد میر خلیقؔ کی ہدایت پر غزل گوئی سے کنارہ کشی کر لی اور مراثی، سلام و رباعیات میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ اُنہوں نے اپنے انتقال سے قبل اپنے مکان کے قریب اپنی تدفین کے لئے سَو روپئے میں زمین خرید لی تھی۔ ۱۸۷۴ء میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے جسدِ خاکی کو اُنہیں کی خریدی ہوئی زمین میں دفن کیا گیا۔

میر انیسؔ قادر الکلام شاعر تھے۔ اُنہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، رباعیوں میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور سلام بھی لکھے ہیں لیکن اُن کا اصل میدان مرثیہ ہے۔ اُن کے مراثی اُردو ادب کا گراں قدر سرمایہ بھی ہیں اور اُن کی شہرت و نام وَری کے ضامن بھی ہیں۔ اُن کے مراثی انسانی سلوک و نفسیات اور جذباتی ردِ عمل کا بہترین نمونہ ہیں۔ واقعہ نگاری، منظر نگاری اور لفظی مصوّری میں اُن کے مراثی اپنی مثال آپ ہیں۔ فصاحت، بلاغت، سلاست اور روانی اُن کے مرثیوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مضامین کو بھی آسان الفاظ میں اس طرح بیان کرنے میں مہارت رکھتے ہیں کہ قاری یا سامع کو کہیں دِقّت محسوس نہیں ہوتی۔ متانت اور سنجیدگی اُن کے کلام کے جوہر ہیں۔ اُن کا کلام رکاکت و ابتذال سے پاک و صاف ہے۔

میر انیسؔ نے مراثی کے مقابلے رباعی کو کم اہمیت دی ہے۔اُن کی زیادہ تر توجّہ مرثیہ گوئی ہی کی طرف رہی ہے۔جب مرثیہ گوئی سے تھوڑی بہت فراغت حاصل ہوتی تو وہ رباعیاں کہہ لیا کرتے تھے۔اس کے باوجود اُن کی رباعیاں اتنی اہم اور اعلیٰ درجہ کی ہیں کہ اُنہیں اُردو ادب کا بیش بہا سرمایہ قرار دیا جاسکتا ہے۔اُن کی بیش تر رباعیاں موضوع،مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے قابلِ قدر اور اہمیت کی حامل ہے۔اُن کی بیش تر رباعیوں کے موضوعات مذہب و اخلاق ہیں۔اُنہوں نے ذاتیات اور دیگر موضوعات پر بھی بہترین رباعیاں تخلیق کی ہیں۔حمد وثنا سے متعلّق رباعیوں میں اللہ تعالیٰ کی مختلف صفات جیسے رزّاقی،ستاری،غفّاری،جود وکرم،رحم وعدل وغیرہ کو بیان کیا گیا ہے۔میر انیسؔ کی متعدد رباعیاں اظہارِ عبدیت کا بہترین نمونہ ہیں۔اُن کی بعض رباعیوں کا رنگ صوفیانہ ہے۔

میر انیسؔ کی متعدّد رباعیاں سرورِ کائنات حضرت محمّد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلّم کے فضائل،اسوۂ حسنہ،سیرت وتعلیمات اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی فضیلت سے متعلّق ہیں۔کئی رباعیوں میں تو رسولِ خدا اور امیر المومنین حضرت علی کے فضائل مشترکہ طور پر نظم کیے گئے ہیں۔میر انیسؔ شیعہ تھے۔وہ حضرتِ امام حُسین اور شہدائے کربلا کی یاد میں گریہ وزاری کرنے یا رونے اور رُلانے کو باعثِ نجات سمجھتے تھے۔اسی لئے وہ عزاداری کو فرض خیال کرتے تھے۔اُن کے مراثی اور سلام کی طرح اُن کی متعدد رباعیاں بھی اُن کے اسی اعتقاد کی وضاحت کرتی ہیں۔اُنہوں نے اپنی رباعیات میں کبر وغرور،حرص وطمع،نخوت وتندخوئی،ہوا وہوس جیسی بُرائیوں سے باز رہنے کی تلقین بھی کی ہے۔

میر انیسؔ فطری طور پر رباعیاں لکھنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔اخلاقی اور دیگر موضوعات پر اعلیٰ درجہ کی رباعیاں تخلیق کرنے کے سبب ہی خواجہ الطاف حُسین حالؔی، میر انیسؔ کو سرتاج الشعرا کہتے تھے۔

03.09 فرہنگ

آدم	: نسلِ انسانی کے پہلے انسان،آدمی،انسان	سَوا	: ایک اور اُس کا چوتھائی حصّہ،افزوں،بیش،زیادہ
آرام ملنا	: سکون حاصل ہونا،تسکین ہونا،قرار آنا	شباب	: جوانی،بلوغت،جوان ہونے کا زمانہ
آگے	: مقابل،سامنے	شفقت	: مہربانی،عنایت
آنکھ بند ہونا	: فوت ہونا،مرجانا،سوجانا	صدا دینا	: آواز کرنا
آہ وزاری	: نالہ وفریاد،آہ وبُکا	صف بستہ	: آراستہ،قطار بند،صف باندھے ہوئے
ادنیٰ	: کم قدر،چھوٹے درجہ کا	طفلی	: بچپن،لڑکپن،بچپن کی عمر
افزوں	: زیادہ،بڑھ کر،بیش	طلب گاری	: خواہش،آرزو،تمنّا
انعام کرنا	: انعام دینا،عطا کرنا،بخشنا	ظرف	: برتن،بھانڈا
باغ	: گلشن،گلزار،چمن،دنیا	عجب	: نادر،انوکھا،حیرت انگیز
بخشنا	: عطا کرنا،عنایت کرنا	عدالت	: انصاف،عدل
برس	: سال،سنہ،بارہ مہینے کی مدّت	عقبیٰ	: آخرت،عاقبت

بیداری : ہوشیاری، ہوش مندی، سمجھ، جاگنے کی حالت
بےزاری ہونا : نفرت ہونا، ناراضی ہونا، خوشی ہونا
بےقراری : اضطراب، بےچینی، بےتابی
پھل ملنا : صلہ پانا، ثمرہ پانا
تہی مغز : خالی دماغ، احمق، نادان، بےوقوف، کم ظرف
ثنا کرنا : تعریف کرنا، مدح کرنا، ستائش کرنا
جا دینا : جگہ دینا، مقام عطا کرنا
جلوہ : تجلّی، نور، علامت، نشانی
جھکنا : تسلیم کرنا، برتری ماننا، خمیدہ ہونا، خم ہونا
حبابِ آب : پانی کا بُلبُلہ
خاکساری : عاجزی، انکساری، فِروتنی
خزاں : پت جھڑ، بےرونقی، زوال، تنزّلی
خواب : خیال، وہ چیز جو انسان نیند کی حالت میں دیکھے
خواب دیکھنا : سوتے میں کسی چیز کو دیکھنا، سپنا دیکھنا
دنداں : دانت
رتبا بخشنا : اعلیٰ و افضل مقام عطا کرنا، عروج بخشنا
رتبہ دینا : کسی مرتبہ پر فائز کرنا، عہدہ عطا کرنا
رعنا : خوش نما، خوب صورت، حسین
رنگ : فام، شبیہ، روپ
سال گرہ : برس گانٹھ، جنم دن کی تقریب، (Birthday)
سرفرازی پانا : سربلند ہونا، اعزاز عطا ہونا، عزّت ملنا
سرور ملنا : فرحت حاصل ہونا، شاد ہونا، شادماں ہونا
سمانا : کھُپنا، شامل ہونا، بسنا، حصّہ بننا
سنگ دل : بےرحم، ظالم، جابر، خودسر
سُو : وہ

عقدہ : راز، پیچیدہ بات
عقدہ کھلنا : راز افشا ہونا، مسئلہ حل ہونا، سمجھ میں آنا
غضب : قہر، غصّہ، عتاب
فِروتنی : عاجزی، انکساری
قدرت : شان، شانِ الٰہی
قوی : زورآور، طاقتور، توانا
کَس : زور، طاقت
کَس جانا : کمزور ہو جانا، قوت نہ رہنا، طاقت کا کم ہو جانا
کفِ پا : پَیر کا تلوا، ادنیٰ، حقیر، انسان
کیا کیا : کس قدر، سب کچھ، بہت کچھ
کیا کیا : کیسے کیسے، حسین، خوب رو، خوب صورت
کھُلنا : ظاہر ہونا، معلوم ہونا، پتہ چلنا
گرہ : گانٹھ، جیب
گرہ سے جانا : ذاتی نقصان ہونا، اپنے پاس سے جانا
گُل : پھول، انسان، آدمی
گُلِ رعنا : عمدہ پھول، اچھے انسان
گُل کھلنا : پھول کا شگفتہ ہونا، کلی کا پھول بن جانا
مُرجھانا : پژمردہ ہو جانا، کمھلانا
مقامِ اعلیٰ : رتبۂ عالی، عروج
مِلنا : حاصل ہونا، میسّر ہونا
نخل : درخت، شجر، پیڑ
نرمی : رحم دلی، بُردباری
نفس : سانس، دَم
ہستی : وجود، زندگی، حیات، زیست
یاں : یہاں کا مخفف، یہاں

03.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ میر انیسؔ کی کسی ایک رباعی کو قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ میر انیسؔ کی کسی رباعی کے مفہوم کو واضح کیجیے۔

سوال نمبر۳ اخلاق سے متعلّق میر انیسؔ کی کسی رباعی پر روشنی ڈالیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ میر انیسؔ کی حیات و شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ میر انیسؔ کا شمار ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے، اظہارِ خیال کیجیے۔

سوال نمبر۳ میر انیسؔ کی حمدیہ و نعتیہ رباعیات کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : میر انیسؔ کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟

(الف) دہلی (ب) رام پور (ج) فیض آباد (د) لکھنؤ

سوال نمبر۲ : میر انیسؔ کے دادا کی شہرہ آفاق مثنوی کا نام کیا ہے؟

(الف) علی نامہ (ب) سحرالبیان (ج) گلزارِ نسیم (د) زہرِ عشق

سوال نمبر۳ : اعلیٰ درجہ کی رباعیاں تخلیق کرنے کے سبب خواجہ الطاف حُسین حالی میر انیسؔ کو کیا کہتے تھے؟

(الف) سرتاج الشعرا (ب) شاعرِ بادماغ (ج) اُستاذ الشعرا (د) شاعرِ اعظم

سوال نمبر۴ : میر انیسؔ کے دادا کا کیا نام ہے؟

(الف) میر مستحسن (ب) میر حسن (ج) میر امامی (د) میر درد

سوال نمبر۵ : میر انیسؔ نے اپنی قبر کے لئے کتنے روپے میں زمین خریدی تھی۔

(الف) ۵۰ (ب) ۱۰۰ (ج) ۲۰۰ (د) ۳۰۰

سوال نمبر۶ : حالیؔ نے اپنی ایک رباعی میں میر انیسؔ کو کیا کہا ہے؟

(الف) شہنشاہِ رباعیات (ب) ہردل عزیز شاعر (ج) لکھنؤ کی آنکھ کا تارا (د) سرتاج الشعرا

سوال نمبر۷ : میر انیسؔ کی وفات کس سنہ عیسوی میں ہوئی تھی؟

(الف) ۱۸۷۴ء (ب) ۱۹۱۴ء (ج) ۱۸۶۸ء (د) ۱۹۰۴ء

سوال نمبر۸ : ''مجموعۂ رباعیات میر انیسؔ مرحوم'' کے مرتّب کا نام کیا ہے؟

(الف) محمد حُسین آزادؔ (ب) میر مہدی حسن احسنؔ (ج) امیر احمد علوی (د) سیّد محمّد عبّاس

سوال نمبر۹ : مندرجہ ذیل میں سے میر انیسؔ نے ابتدا میں کون سا تخلّص اختیار کیا تھا؟

(الف) خیام (ب) قلق (ج) حزیں (د) دلگیر

سوال نمبر۱۰ : میر انیسؔ کی وفات کہاں ہوئی تھی؟

(الف) فیض آباد (ب) الٰہ آباد (ج) کان پور (د) لکھنؤ

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱	: (ج) فیض آباد	جواب نمبر۶	: (د) سرتاج الشعرا
جواب نمبر۲	: (ب) سحرالبیان	جواب نمبر۷	: (الف) ۱۸۷۴ء
جواب نمبر۳	: (الف) سرتاج الشعرا	جواب نمبر۸	: (د) سیّد محمّد عبّاس
جواب نمبر۴	: (ب) میر حسن	جواب نمبر۹	: (ج) حزیں
جواب نمبر۵	: (ب) ۱۰۰	جواب نمبر۱۰	: (د) لکھنؤ

03.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ یادگارِ انیسؔ از امیر احمد علوی

۲۔ انیسیات از مسعود حسن رضوی ادیب

۳۔ آبِ حیات از محمّد حُسین آزادؔ

۴۔ واقعاتِ انیسؔ از میر مہدی حسن احسنؔ

✵

اکائی 04 خواجہ الطاف حُسین حالؔی (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

04.01 : اغراض ومقاصد
04.02 : تمہید
04.03 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی
04.04 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی بحیثیت رباعی گو
04.05 : رباعیاتِ حالؔی (اقتباس)
04.06 : رباعیاتِ حالؔی (تشریح)
04.07 : خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی منتخب دیگر رباعیاں
04.08 : خلاصہ
04.09 : فرہنگ
04.10 : سوالات
04.11 : حوالہ جاتی کتب

04.01 اغراض ومقاصد

خواجہ الطاف حُسین حالؔی کا شعری ونثری سرمایہ جس قدر اہم ہے اُسی قدر اُن کی شخصیت وسوانح بھی اہمیت کی حامل ہے جس سے اُردو کے ہر طالب علم کے لئے واقفیت ہونا ضروری ہے۔ آپ اس اکائی کے ذریعہ حالؔی کے حالاتِ زندگی اور اُن کی رباعیات کے تعلق سے تفصیلی مطالعہ بھی کریں گے اور رباعی کے روایتی وجدید موضوعات سے بھی واقف ہو سکیں گے۔ اس اکائی میں حالؔی کی مختلف موضوعات پر مشتمل دَس رباعیوں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ شاملِ نصاب رباعیات کے معانی ومفاہیم بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ اگر آپ رباعیوں اور اُن کے مفاہیم پر توجّہ دیں گے تو نہ صرف حالؔی کی دیگر رباعیوں کے مفاہیم آسانی سے سمجھ سکیں گے بلکہ دیگر رباعی گو شعرا کی رباعیوں کے مطالب بھی اپنے آپ سمجھنے لگیں گے۔

04.02 تمہید

نثر ہو یا نظم خواجہ الطاف حُسین حالؔی کو دونوں پر عبور حاصل تھا۔ گزشتہ صدی میں اُردو کے شعری ونثری سرمائے میں جو اضافے ہوئے ہیں اُن میں حالؔی کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اُنہوں نے نثری تصانیف کے علاوہ غزل، نظم، قصیدہ، مرثیہ، مسدّس، ترکیب بند، قطعہ اور رباعی جیسی اصنافِ سخن میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔

اگر چہ حالؔی نے دیگر شعری اصنافِ سخن کی بہ نسبت رباعیاں کم کہی ہیں مگر اُنھوں نے جتنی بھی رباعیاں کہی ہیں اُن میں سے بیش تر اعلیٰ درجہ کی رباعیاں ہیں۔ حالؔی کی رباعیاں روایتی موضوعات پر بھی مبنی ہیں اور اپنے دَور کے حالات و مسائل کی بھی عکّاس ہیں۔ اُنھوں نے غزلوں اور نظموں کی طرح رباعیات کے ذریعہ قوم کو پستی و ذلّت سے بچانے، بے حسی کی فضاؤں میں حرکت و عمل کی روح پھونکنے، سوتوں کو جگانے، یکجہتی و ہم آہنگی کا مظاہرہ کرنے اور اخوّت و محبت سے زندگی گزارنے کا پیغام بھی دیا ہے۔ حالؔی کی نثری و دیگر شعری تخلیقات کا جس ذوق و شوق سے مطالعہ کیا جاتا ہے اُسی دل چسپی سے اُن کی رباعیات کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ آپ اُن کی دیگر تخلیقات و تصنیفات کے علاوہ اُن کی رباعیوں اور اُن کے معانی و مفاہیم سے بھی آگاہ ہو سکیں گے۔

04.03 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کے حالاتِ زندگی

خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی شخصیت کثیر الجہت تھی۔ وہ اعلیٰ پایہ کے ادیب و شاعر بھی تھے، مصلحِ قوم بھی تھے اور محبِّ وطن بھی اور سب سے بڑھ کر شریف، صاف دل اور فرشتہ خصائل انسان بھی تھے۔ اُنھوں نے نثر میں مجالس النساء، مقدّمۂ شعر و شاعری، حیاتِ سعدی، حیاتِ جاوید، یادگارِ غالب جیسی معرکۃ الآرا کتابیں لکھیں اور غزل، نظم، مثنوی، قصیدہ، رباعی، قطعہ، مسدّس ترکیب بند وغیرہ جیسی شعری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ حالؔی کا اہم کارنامہ ''مقدّمۂ شعر و شاعری'' ہے جو اصلاً اُن کے شعری مجموعہ کا مقدّمہ تھا۔ جس نے اپنی اہمیت و افادیت کے سبب باقاعدہ ایک مستقل کتاب کی حیثیت اختیار کر لی۔ اس مقدّمہ میں حالؔی نے شاعر ہونے کی شرائط، شاعری کے اصول، شاعری کی خوبیوں وغیرہ پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، مرثیہ وغیرہ کی اصلاح کی تدابیر پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اُنھوں نے شیخ سعدیؔ، غالبؔ اور سر سیّد احمد خاں کی سوانح لکھ کر سوانح نگاری کو بلند مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔ اُنھوں نے ناول کے پیرایے میں قلم بند کی گئی اپنی ایک تصنیف مجالس النساء میں تعلیمِ نسواں کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ شاعری میں حالؔی کی شہرہ آفاق تخلیق ''مدّ و جزرِ اسلام'' ہے جو ''مسدّسِ حالی'' کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کی طویل نظموں 'برکھا رُت، حُبِّ وطن، چپ کی داد اور مناجاتِ بیوہ'' کا شمار بہترین تخلیقات میں کیا جاتا ہے۔ غزلیں ہوں یا نظمیں، رباعیاں ہوں یا قطعات حالؔی نے ہر صنف میں اصلیت اور قلبی جذبات کو نہایت سنجیدگی، متانت اور خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ دراصل اپنی شاعری کے ذریعہ معاشرے کی اصلاح اور قوم کو بیدار کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ اُن کی متعدد نظمیں تراجم کے ذریعہ دوسری زبانوں میں بھی منتقل ہو چکی ہیں۔

خواجہ الطاف حُسین حالؔی ضلع کرنال کے قصبہ پانی پت کے محلّہ انصار میں واقع اپنے بڑے بھائی خواجہ امداد حُسین کے مکان میں ۱۸۳۷ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد کا نام ایزد بخش ہے۔ حالؔی کا تعلّق خاندانِ خواجگانِ انصاری سے تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم پانی پت میں ہوئی۔ عام دستور کے مطابق اُنھیں ساڑھے چار سال کی عمر میں قرآن شریف کی تعلیم کے لئے وہاں کے قاری حافظ ممتاز حُسین انصاری کی شاگردی میں دے دیا گیا۔ چوں کہ اُن کا حافظہ غیر معمولی طور پر اچھا تھا اس لئے اُنھوں نے کچھ ہی مدّت میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ اس کے بعد اُنھوں نے پانی پت کے کئی علما سے فارسی و عربی کی تعلیم حاصل کی اور صرف و نحو کی ابتدائی کتب کا مطالعہ بھی کیا۔ حالؔی کی عمر ابھی ۱۷ سال ہی کی تھی کہ اُن کے بڑے بھائی نے اُن کی مرضی کے خلاف اپنے ماموں کی دختر اسلام النساء کے ساتھ اُن کا نکاح کرا دیا۔ بیوی کا تعلّق کا ایک خوش حال گھرانے سے تھا اس لئے حالؔی تلاشِ معاش کے لئے زیادہ فکر مند نہیں تھے۔

اُنھوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لئے دلّی جانے کا قصد کرلیا۔ایک دن جب اُن کی بیوی میکے میں تھیں تو وہ کسی سے کچھ کہے بغیر پوشیدہ طور پر دلّی کے لئے روانہ ہوگئے۔خوش قسمتی سے جامع مسجد کے قریب مولوی حُسین بخش کے مدرسہ میں اُنھیں داخلہ مل گیا۔یہ وہ زمانہ تھا جب بنگال میں انگریزی تعلیم عام ہوتی جا رہی تھی۔شمالی ہندوستان کے چند تعلیمی ارادوں میں انگریزی سکھائی جانے لگی تھی۔قدیم دہلی کالج میں بھی انگریزی کے درجات قائم ہوگئے تھے۔انگریزی کی مخالفت مُلک گیر پیمانہ پر شروع ہوچکی تھی۔جن اسکولوں میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی اُنھیں ''مَجہلے''،یعنی جہالت کی جگہ کہا جاتا تھا۔اس لئے حاؔلی نے کبھی بھول کر بھی انگریزی زبان کے اداروں کی طرف رُخ نہیں کیا۔

حاؔلی کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔وہ قیامِ دلّی کے زمانہ میں دلّی میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ایک روز اتّفاقاً اُن کی ملاقات مرزا اسداللہ خاں غالبؔ سے ہوگئی۔اس کے بعد اکثر اُن سے ملاقاتیں ہونے لگیں۔اُنھوں نے اپنا کلام اصلاح کے لئے غالبؔ کو دکھایا۔اگرچہ غالبؔ آسانی سے کسی کے کلام کی اصلاح نہیں کرتے تھے مگر اُنھیں حاؔلی کا کلام پسند آیا۔اُنھوں نے حاؔلی سے کہا:''مَیں ہر کس وناکس کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیتا ہوں مگر تمہارے متعلّق میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبعیت پر سخت ظلم کروگے۔''غالبؔ کی حوصلہ افزائی کے سبب حاؔلی کی شعرگوئی کو جلا ملی اور وہ شعرگوئی کی طرف کچھ زیادہ ہی توجّہ دینے لگے۔اُس وقت حاؔلی کا تخلص خستہؔ تھا۔واضح ہو کہ قیامِ دہلی کے دوران حاؔلی کو طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اُنھیں دو وقت کی روٹی بھی میسّر نہیں ہو رہی تھی۔وہ تکیہ کی جگہ سر کے نیچے اینٹ رکھ کر سو جاتے تھے یعنی اُس وقت اُن کی حالت نہایت خستہ تھی۔شاید اسی لئے اُنھوں نے حسب حال اپنا تخلص ''خستہؔ'' تجویز کیا ہوگا۔

حاؔلی کے عزیز واقارب کو اُن کے دلّی میں موجود ہونے کی کسی طرح بھنک لگ گئی۔وہ اُنھیں لینے کے لئے دلّی آگئے۔اُن کے ساتھ اُن کے بڑے بھائی بھی تھے۔اُن لوگوں نے کسی طرح پانی پت واپس چلنے کی حاؔلی کو مجبور کردیا اور ۱۸۵۵ء میں وہ پانی پت واپس آگئے۔اسی دوران اُن کی بیوی کے بطن سے ایک لڑکا بھی پیدا ہوا جس کا نام خواجہ اخلاق حُسین رکھا گیا۔حاؔلی کو اب معاش کی فکر ہونے لگی۔وہ ۱۸۵۶ء میں تلاشِ معاش کے لئے پانی پت سے حصار پہنچے جہاں اُن کو ڈپٹی کمشنر کے دفتر میں معمولی تنخواہ پر ملازمت مل گئی۔کچھ عرصہ کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ برپا ہوگیا جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔حصار بھی اس کی چپیٹ میں آگیا۔حاؔلی نے ناچار ہو کر پانی پت کا رُخ کیا اور وہ اپنے وطن کے لئے پیدل ہی روانہ ہوگئے۔سفر کی صعوبت اور گرمی کی شدّت کے سبب اُنھیں اسہال کی شکایت ہوگئی۔وہ اس مرض میں تقریباً ایک سال تک مبتلا رہے۔ناسازگار حالات کے سبب حاؔلی کو مسلسل چار سال تک پانی پت ہی میں رہنا پڑا۔اُس دوران اُنھوں نے وہاں کے علما سے منطق،حدیث اور تفسیر کی کتابیں پڑھیں۔اس عرصہ میں حاؔلی کے یہاں کئی بچّوں کی پیدائش بھی ہوئی جن میں سے کئی بچّوں کی وفات ہوگئی۔

حاؔلی کی ذمّہ داریوں میں کافی اضافہ ہوگیا تھا اس لئے اُنھیں تلاشِ معاش کی فکر ستانے لگی۔وہ پھر دلّی آگئے۔غالباً اسی زمانہ میں اُنھوں نے مرزا غالب کے کہنے سے اپنے تخلص خستہؔ کو ترک کرکے اپنے لئے حاؔلی تخلص اختیار کیا ہوگا۔حاؔلی پہلے کی طرح پھر علمی مجلسوں،ادبی محفلوں اور مشاعروں میں شرکت کرنے لگے۔اسی زمانے میں اُن کی ملاقات نواب مصطفیٰ خاں رئیسِ دلّی وتعلّقہ دار جہاں گیرآباد ضلع بُلند شہر سے ہوئی جن کا تخلص اُردو میں شیفتہؔ اور فارسی میں حسرتیؔ تھا۔اُن کا مذاقِ شاعری بہت بلند تھا اور وہ غالبؔ کے شاگرد بھی تھے۔وہ حاؔلی کی لیاقت اور ذوقِ سخن سے بہت متاثر ہوئے اور اُنھیں جہاں گیرآباد میں اپنے بچّوں کا اتالیق مقرر کردیا۔

حالؔی اور شیفتہ آٹھ سال تک ایک دوسرے کے قریب رہے۔ اگر چہ حالؔی اپنا کلام اصلاح کے لئے مرزا غالبؔ کی خدمت میں دلّی ارسال کیا کرتے تھے مگر اُن کے شعری وادبی ذوق کو مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کی صحبت سے زیادہ فائدہ ہوا۔ ۱۸۶۹ء میں شیفتہؔ کی وفات ہوگئی۔ حالؔی پھر فکرِ معاش میں مبتلا ہوگئے۔ وہ تلاشِ معاش کے سلسلہ سے لاہور پہنچے۔ وہاں وہ پنجاب بُک ڈپو میں ملازم ہوگئے۔ اُن کے سپرد انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت کو درست کرنے کا کام سونپا گیا جسے وہ بڑی خوش اُسلوبی اور لگن سے کرتے رہے۔ اس طرح اُنہیں انگریزی زبان وادب کی بہت سی کتابوں سے نہ صرف واقفیت ہوگئی بلکہ اُنہوں نے اچھّی خاصی انگریزی بھی سیکھ لی۔ یہی نہیں اُن کا شعری ذوق اور ادبی رجحان بھی بدلنے لگا۔

مغربی ادب کی خوبیوں سے متاثر ہونے کے سبب مشرقی اور بالخصوص فارسی ادب سے اُن کی دل چسپی کم ہونے لگی۔ مولانا محمّد حُسین آزادؔ نے ۱۸۷۴ء میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی جس میں مصرع طرح کے بجائے شاعروں کو نظم یا مثنوی لکھنے کے لئے کوئی عنوان یا موضوع دے دیا جاتا تھا۔ شعرا حضرات کو پوری آزادی تھی کہ وہ جس اسلوب اور جس بحر میں چاہیں متعلّقہ عنوان یا موضوع کے تحت اپنے خیالات نظم کر سکتے ہیں۔ حالؔی نے ان مشاعروں میں پڑھنے کے لئے کئی نظمیں کہی تھیں جن میں برکھا رُت، نشاطِ اُمّید، مناظرۂ رحم وانصاف اور حُبِ وطن اہم ہیں۔ اُنہوں نے قیامِ لاہور کے دوران نثر میں بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں سے مجالس النساء بہت اہم ہے۔

حالؔی کو بہت دنوں تک لاہور کی ہَوا راس نہیں آئی۔ وہ پھر دہلی آگئے۔ یہاں وہ ایک اینگلو عربک اسکول میں درس وتدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ ۱۸۸۷ء میں اس اسکول سے تبادلہ کر کے اُنہیں کرسچین کالج لاہور کے بورڈنگ ہاؤس میں طلبا کا اتالیق مقرر کر دیا گیا۔ وہ وہاں طلبا کے رہن سہن اور عادت واطوار سے بہت جلد دل برداشتہ ہوگئے اور تین مہینے سے پہلے ہی اس عہدے سے خود سبکدوش ہوکر ۵/جون ۱۸۸۷ء کو واپس دہلی آگئے۔ اُسی زمانہ میں اُن کی ملاقات سر سیّد احمد خاں سے ہوئی تو وہ ایک طرح سے سر سیّد ہی کے ہوکر رہ گئے۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کے باقی ۳۸/سال سر سیّد احمد خاں کے ساتھ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے، معاشرے کے بگڑے مذاق کو سنوارنے، اخلاق و کردار کو پھر سے بلند کرنے اور لوگوں کو جدید علوم وفنون سے بہرہ ور کرنے کے کام میں صرف کر دیے۔

اسی سال ۱۸۸۷ء میں سر سیّد احمد خاں کے اصرار پر سر آسماں جاہ بہادر مدارالمہام حیدر آباد دکن علی گڑھ تشریف لائے۔ سر سیّد نے حالؔی کا اُن سے تعارف کرایا۔ نواب آسماں جاہ اُن کی شخصیت، سیرت اور غیر معمولی قابلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے امدادِ مصنفین کے صیغے سے ۷۵/روپئے ماہ وَار کا وظیفہ حالؔی کے نام جاری کرا دیا۔ وظیفہ مقرر ہونے کے بعد حالؔی نے اینگلو عربک اسکول کی ملازمت چھوڑ دی۔ اب وہ آزادانہ طور پر علی گڑھ کالج کی امداد کے سلسلہ میں سفر کرتے، علمی اور ادبی جلسوں میں شرکت کرتے اور ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف میں بھی مصروف رہتے۔ وہ ۱۸۹۱ء میں سر سیّد احمد خاں کے ساتھ حیدر آباد بھی گئے تھے جہاں سے وہ علی گڑھ کالج کے لئے اُمّید سے زیادہ چندہ لے کر واپس آئے تھے۔ اُنہیں حیدر آباد سے جو ۷۵/روپئے ماہ وَار وظیفہ ملتا تھا اُسی زمانے میں اُسے بڑھا کر ۱۰۰/روپئے ماہ وَار کر دیا گیا۔ حالؔی جب تصنیف وتالیف کے علاوہ قوم ومُلک کی خدمت بڑے انہماک سے کر رہے تھے کہ ۱۹۰۰ء میں اُن کی اہلیہ کی وفات ہوگئی۔ اگر چہ حالؔی کو اپنی رفیقِ حیات کے انتقال کا بہت رنج ہوا مگر اُنہوں نے نہایت صبر وضبط کا مظاہرہ کیا۔ حالؔی شہرت ونام وَری کے بجائے کام کرنے میں یقین رکھتے تھے۔

۱۹۰۴ء میں اُن کی علمی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں سرکار نے اُنہیں شمس العلما کے خطاب سے نوازا تھا۔ جب حالؔی کی آنکھوں کی بینائی بہت کم ہوگئی تو وہ ۱۹۱۱ء میں آنکھوں کے علاج کے لئے لکھنؤ گئے مگر وہاں اُنہیں خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا البتّہ وہ عینک کی مدد سے لکھنے پڑھنے کا کام کرنے لگے۔ وہ جولائی ۱۹۱۲ء میں اپنا علاج کرانے کے لئے شملہ گئے لیکن وہاں بھی صحت یاب نہ ہوسکے۔ اس کے بعد اکتوبر ۱۹۱۲ء میں اپنے ہم وطن ڈاکٹر لیاقت حُسین خالد کے یہاں فرید آباد چلے گئے جہاں اُنہوں نے چند ماہ قیام کیا اور جنوری ۱۹۱۳ء میں اپنے وطن پانی پت واپس آ گئے۔

حالؔی اپنی آخری سانس تک تصنیف وتالیف میں مشغول رہنا چاہتے تھے۔ اُن کی خواہش تھی کہ اُردو زبان کی تذکیر و تانیث کے اصول مرتّب کیے جائیں، اعلیٰ درجہ کے ناول اور ڈرامے تخلیق کیے جائیں، دوسری زبانوں کے بلند پایہ ڈراموں اور ناولوں کو تراجم کے ذریعہ اُردو میں منتقل کیا جائے مگر اُن کی وفات سے کچھ مہینے پہلے اُن کے دماغی اعصاب کا توازن بگڑ گیا اور وہ ۳۱ ردسمبر ۱۹۱۴ء کو اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ اُن کے جسدِ خاکی کو پانی پت میں درگاہ قلندر صاحب کے صحن مسجد کے حوض کے کنارے دفن کر کے سپردِ خاک کر دیا گیا۔

04.04 خواجہ الطاف حُسین حالؔی بحیثیت رباعی گو

حالؔی نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اُن کے دیوان میں دیگر اصنافِ سخن کے ساتھ رباعیات بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد رباعیاتِ حالؔی کے نام سے متعدد ایڈیشن بھی منظر عام پر آ چکے ہیں اور اُن کے انگریزی تراجم بھی ہو چکے ہیں۔ حالؔی فطری طور پر رباعیاں لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ اُنہوں نے اپنے خیالات کو عام کرنے اور اپنے مشن کی تبلیغ و ترویج کے لئے رباعیات کو ذریعہ بنایا۔ وہ اپنے خیالات ونظریات کو بڑی صفائی، سادگی اور سلاست کے ساتھ آسان اور عام فہم انداز میں رباعی کے قالب میں ڈھالنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اعلیٰ پایے کی رباعیاں تخلیق کرنے کی بدولت حالؔی کو سعدیٔ ہند کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حالؔی کی بیش تر رباعیات کے موضوعات مذہب وتصوف، فلسفہ وحکمت، تعلیم و تربیت، پند وموعظت، کردار واخلاق، مُلک وملّت، مشقّت وعمل، تمدّن ومعاشرت اور ادب وسیاست ہیں۔ اُنہوں نے مذہب وتصوف اور حمد ونعت سے متعلّق رباعیات میں مذہبی رواداری، مساواتِ انسانی، عالمی محبت اور ہم آہنگی ویکجہتی کی اہمیت وافادیت کا ذکر کیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انسان کا تعلّق خواہ کسی مذہب، فرقہ، قوم یا نسل سے ہو وہ براہِ راست یا بالواسطہ ایک ہی خدا کی عبادت یا پرستش کرتا ہے۔ سب کسی نہ کسی روپ میں اُسی کی وحدانیت کے قائل ہیں۔ آتش پرست ہوں یا مادہ پرست، گبر ہوں یا دہریے، منکر ہوں یا ملحد سب خالقِ ارض وسما کی قدرت کو تسلیم ضرور کرتے ہیں۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں ؎

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دَہری نے کیا دَہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

☆

حالؔی نے حمد وتوحید کے علاوہ نعتیہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ اُنہوں نے ایسی رباعیات کے ذریعہ فخرِ کائنات، ہادیٔ اسلام محمّد مصطفیٰ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت، کردار، پیغامات اور تعلیمات سے روشناس کرایا ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر آبا کو بھی ہے تیری ابوّت سے شرف

☆

زہّاد کو تُو نے محوِ تمجید کیا عشّاق کو مستِ لذّتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کی ساجھی کوئی توحید کو تُو نے آ کے توحید کیا

حالؔی نے قوم کی زبوں حالی اور ملّتِ اسلامیہ کے زوال کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا تھا۔مسلمانوں کی تباہ حالی کا درد اُن کی رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔وہ مسلمانوں کی بے حسی اور بے عملی پر آنسو بہانے کے بجائے اللہ ورسولؐ کی اطاعت کرنے ،میدانِ کارزار میں عمل پیرا ہونے اور بلند کردار و بااخلاق بننے کی تلقین کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس کے جوتنے سے دہقان یاد آئی ہمیں قوم کے ادبار کی شان

حالؔی کی بیش تر رباعیات میں اخلاقی واصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔اُنہوں نے احساسِ کمتری میں مبتلا قوم کو پستی و بدحالی کے غار سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور اپنی رباعیات کے ذریعہ جمود وقنوطیت کے دائرے سے نکل کر حرکت ورجائیت کے جذبات بیدار کرنے کا درس دیا ہے۔وہ آرام طلبی،لہوولعب اور تعیّش پسندی کو مَوت کے مترادف سمجھتے ہیں محنت ومشقّت ،ہمّت وحوصلہ،علم وزندہ دلی اور عزم واستقلال کو کامیابی کی ضامن بھی قرار دیتے ہیں۔

محنت ہی کے پھل ہیں یہاں ہراک دامن میں محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی جب تک نہ چرائیں بکریاں مدیَن میں

☆

اے علم! کلیدِ گنجِ شادی تُو ہے سرچشمۂ نعما و اَیادی تُو ہے
آسائشِ دوجہاں ہے سایے میں ترے دنیا کا وسیلہ، دین کا ہادی تُو ہے

☆

اے عیش وطرب! تُو نے جہاں راج کیا سلطاں کو گدا، غنی کو محتاج کیا
ویراں کیا تُو نے نینوا اور بابُل بغداد کو ،قرطبہ کو تاراج کیا

☆

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے؟ آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرتے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتاؤ طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے

☆

دولت نے کہا مجھ سے ہے ''عزت ہے جہاں''
فرمایا ہنر نے ''مَیں ہوں عزت کا نشاں''
عزت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں
مَیں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

☆

حالؔی کی متعدد رباعیاں حالاتِ حاضرہ اور اپنے دَور کے مسائل کی ترجمان ہیں۔ اُنہوں نے سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں جیسے نخوت و غرور، خود پسندی و خود غرضی، غیبت و خصومت، بدگوئی و بدخواہی، نفاق و نااتّفاقی، جہالت و اسراف، حسد و کینہ، کاہلی و پست ہمّتی سے قوم و ملّت کو آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں ؎

رونق ہے ہر اک بزم کی اب غیبت میں
بدگوئیِ خلق ہے ہر اک صحبت میں
اَوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں
خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمّت میں

☆

آبا کو زمین و مِلک پر اطمینان
اولاد کو سُستی پہ قناعت کا گمان
بچّے آوارہ اور بے کار جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

حالؔی کی بعض رباعیاں غزل کے روایتی مضامین کی نمائندگی کرتی ہیں جس میں معاملاتِ حُسن و عشق، ہجر و وصال، عشقیہ جذبات اور شانِ تغزل کی نمایاں طور پر جلوہ گری ہے۔ بطورِ نمونہ پیش ہے ایک رباعی ؎

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گزرے؟
اک خستہ جگر کی رات کیوں کر گزرے؟
گزری نہ ہو جس بغیر یہاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گزرے؟

حالؔی نے نوّاب محسن الملک کی قومی و ملّی خدمات کے علاوہ اُن کی اور نوّاب ضیاء الدین احمد خاں وغیرہ کی وفات سے متاثر ہو کر متعدد رباعیاں کہی ہیں ؎

پیری میں جوانوں کو کیا مات اُس نے
آرام پہ اپنے مار دی لات اُس نے
تدبیر سے، محنت سے دکھا دی اُس کو
کالج کی ترقی میں کرامات اُس نے

☆

غالبؔ ہے نہ شیفتہؔ نہ نیّرؔ باقی
وحشتؔ ہے نہ سالکؔ ہے نہ انورؔ باقی
حالؔی اب اِسی کو بزمِ یاراں سمجھو
یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

دراصل حالؔی، میر انیسؔ کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ اسی لئے اُنہوں نے انیسؔ کی طرح اپنی رباعیوں میں ہر قسم کے اخلاقی مضامین نظم کیے ہیں اور اُن سے سماجی و معاشرتی اصلاح کا کام بھی لیا ہے۔ اُن کی رباعیات کی زبان عام طور پر آسان، سادہ اور سلیس ہے البتّہ کہیں کہیں ثقیل اور گراں الفاظ بھی نظر آ جاتے ہیں۔ بعض رباعیوں میں تعقیدِ لفظی کا نقص بھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حالؔی کی ژرف نگاہی نے جو دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا اور جن مسائل و تجربات سے وہ اپنی زندگی میں دوچار ہوئے اُن سب کی آئینہ دار اُن کی رباعیاں ہیں۔

04.05 رباعیاتِ حالؔی (اقتباس)

﴿۱﴾

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ
اور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیسؔ
دلّی تھی جڑ اُس کی، لکھنؤ اُس کی بہار
دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

﴿۲﴾

دَم بھر نہ کبھی جان کو آرام دِیا
خدمت کے لئے قوم کی، مَر مَر کے جِیا
پیری ہوئی سدِّ راہ اُس کی، نہ مرض
صدیوں کا تھا جو کام، وہ برسوں میں کیا

﴿۳﴾

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دَہری نے کیا دَہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

﴿۴﴾

اے عشق! کیا تُو نے گھرانوں کو تباہ
پیروں کو خَرِف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری
قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

﴿۵﴾

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے
ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں مَیں
کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

﴿۶﴾

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو
رُودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

﴿۷﴾

اے علم! کیا ہے تُو نے مُلکوں کو نہال
غائب ہوا تُو جہاں سے، وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح
جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

﴿۸﴾

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا
کی مَیں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ”ہے اِس کا اُن کی گردن پہ وبال
دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا“

﴿۹﴾

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں　　شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ "ہے جہنم دنیا"　　وہ آئیں اور اِس بہشت کی سیر کریں

﴿۱۰﴾

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو　　تو اُس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو اگر احسان تو کر دو اُسے عام　　اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

☆

04.06 رباعیاتِ حالؔی (تشریح)

دلّی کی زبان کا سہارا تھا انیسؔ　　اور لکھنؤ کا انجمن آرا تھا انیسؔ
دلّی تھی جڑ اُس کی، لکھنؤ اُس کی بہار　　دونوں کو ہے دعویٰ کہ ہمارا تھا انیسؔ

حالؔی اس پہلی رباعی میں کہتے ہیں کہ میر انیسؔ دلّی کی زبان کا سہارا یعنی آبرو ہیں اور دبستانِ لکھنؤ کی آنکھ کا تارا ہیں۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ انیسؔ کا کلام فصاحت و بلاغت کا بے مثال نمونہ ہے۔ اسی لئے اہلِ دہلی انیسؔ کی قدر و منزلت کرتے ہیں اور زبان داں ہونے کے سبب ہی وہ اہلِ لکھنؤ کی آنکھ کا تارا ہیں یعنی ہر دل عزیز ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں حالؔی کہتے ہیں کہ اگر دلّی کو جڑ تسلیم کر لیا جائے تو لکھنؤ اُس کی بہار ہے۔ اسی لئے اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ یعنی دونوں دبستانوں کے نام وَر شعرا و اُدَبا اور اہلِ زبان دعویٰ کرتے ہیں کہ انیسؔ پر اُن کا حق ہے۔ غرض انیسؔ کو لکھنؤ میں جس قدر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اسی قدر وہ دہلی میں بھی مقبولِ خاص و عام ہوئے۔

دَم بھر نہ کبھی جان کو آرام دِیا　　خدمت کے لئے قوم کی، مَر مَر کے جِیا
پیری ہوئی سدِّ راہ اُس کی، نہ مرض　　صدیوں کا تھا جو کام، وہ برسوں میں کیا

حالؔی نے دوسری رباعی میں نواب محسن الملک کا نام لیے بغیر اُن کے بے مثال کارناموں اور انتھک محنت کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نواب محسن الملک نے قوم و مُلک کی ترقّی کے لئے رات دن ایک کر کے کام کیا۔ اُن کے دل میں کبھی آرام کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ خدمتِ خلق اور قوم کی بھلائی کے لئے مر مر کر جیتے رہے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ پیری یعنی ضعیف العمری میں بھی اس قدر محنت و مشقّت سے کام کرتے رہے کہ نوجوان افراد کے بھی پسینے چھوٹ جائیں۔ طبیعت کے خراب ہونے یا کسی مرض میں مبتلا ہونے والا پوری طرح تندہی سے کام نہیں کر سکتا مگر نواب محسن الملک کی پیری یا ضعیفی اور بیماری بھی اُنہیں قوم کی خدمت کرنے سے نہیں روک سکی۔ اُنہوں نے اپنی پوری زندگی قوم کی خدمت، فلاح اور بھلائی کے لئے وقف کر دی تھی۔ دراصل اُنہوں نے چند برسوں میں وہ اہم کام کر دکھائے جنہیں صدیوں میں بھی انجام تک پہنچانا محال تھا۔

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا　　آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دَہری نے کیا دَہر سے تعبیر تجھے　　انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا

حالی نہایت دین دار اور مذہبی شخص تھے۔ اُنہیں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر یقینِ کامل تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے نور اور جلوہ کو ہر شے میں محسوس کرتے تھے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دنیا کے تمام مذاہب کے پیرو اور دنیا کا ہر شخص اپنے عقائد و ایمان کے موافق قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ پر یقین رکھتا ہے۔ اسی لئے وہ اپنی تیسری رباعی میں کہتے ہیں کہ ہندو جو بُت پرست ہیں، بُتوں کی پوجا کرتے ہیں، اُنہیں بھی اُن پتھروں کے بتوں میں تیرا ہی جلوہ نظر آتا ہے۔ آتش پرست یعنی مجوسی، جو آگ کی پرستش کرتے ہیں، وہ بھی آگ میں تیرے ہی نور کا مشاہدہ کرتے ہیں اور تیری ہی تعریف کے راگ الاپتے ہیں۔ یہاں تک کہ جو دہریے یعنی مادہ پرست یا خالص دنیا دار ہیں اور جو مادی وجود ہی کو حقیقت سے تعبیر کرتے ہیں وہ بھی تیری قدرت کا مشاہدہ علّت ومعقول میں بندھے ہوئے مادی حوادث میں کرتے ہیں یعنی منکر وملحد بھی مادہ کا اقرار کرکے خالقِ کائنات کی قدرتِ کاملہ کو تسلیم کرنے کے لئے مجبور ہیں۔ غرض دنیا میں ایسا کوئی بھی انسان نہیں ہے جو تیرے وجود اور تیری قدرتِ کاملہ سے انکار کرسکے۔

اے عشق! کیا تُو نے گھرانوں کو تباہ پیروں کو خَرِف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری قوموں کو ذلیل، خاندانوں کو تباہ

حاؔلی نے چوتھی رباعی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے خواہ کتنا ہی غافل اور بے خبر ہو جائے مگر مصیبت کے وقت اُسے خدا ہی یاد آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جس وقت طوفان یا منجدھار میں کشتی پھنس جاتی ہے اور بھنور سے نکلنے کی کوئی اُمّید بھی باقی نہیں رہتی، جب وادی میں قافلہ والے بھٹک جاتے ہیں اور ہر سہارا ٹوٹ جاتا ہے تو اُس وقت زباں پر تیرا ہی نام آتا ہے۔ اپنی عافیت کے لئے لوگ تجھے ہی پکارتے ہیں۔ اُنہیں تیرے علاوہ اپنی مدد کے لئے کوئی یاد نہیں آتا ہے۔ دراصل حاؔلی اپنی اس رباعی کے ذریعہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی موجودگی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ انسان جب کسی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اُس کی زبان پر بے ساختہ اللہ ہی کا نام آتا ہے اور وہ اپنی مدد کے لئے یعنی آئی ہوئی مصیبت سے نجات حاصل کرنے کے لئے خدا ہی کو پکارتا ہے۔

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں مَیں کہتا ہوں کہ اب دیکھیے کیا ہوتا ہے؟

حاؔلی نے پانچویں رباعی کے ذریعہ دنیا و مافیہا سے بے خبر رہنے، عیش وعشرت اور لہو ولعب میں زندگی گزارنے والوں کو اُن کے انجامِ بد سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اُنہیں سمجھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ عیش وعشرت کا نتیجہ ہمیشہ تلخ اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ہر قہقہہ کے بعد آہ وبکا کا ہونا ناگزیر ہے۔ اس لئے عیش وآرام کی زندگی کو ترک کرکے اپنی ذمّہ داریوں اور اپنے فرائض پر توجّہ دینا چاہیے۔ وہ تیسرے اور چوتھے مصرعوں میں یہ بھی کہتے ہیں کہ جو قوم عیش دوست ہو جاتی ہے یعنی عیش وعشرت اور لہو ولعب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ مَیں اُس کے انجام سے ڈرنے لگتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ خدا معلوم اس عیش کوشی کا نتیجہ کیا ہوگا۔ دراصل حاؔلی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ عیش وعشرت میں مبتلا قوموں کا ایک نہ ایک دن زوال ضرور ہوتا ہے۔ اُنہیں اندوہ ناک اور عبرت انگیز نتیجے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ دوسرے الفاظ میں حاؔلی کی بات کو اس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ عیش وعشرت کو ترک کرکے حرکت وعمل کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ حرکت وعمل میں برکت ہے اور اسی سے ترقّی کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے۔

دنیا کو ہمیشہ نقشِ فانی سمجھو رُودادِ جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

حالؔی نے چھٹویں رباعی میں دنیا کی بے ثباتی اور آخری سانس تک متحرک اور باعمل رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہر چیز کی طرح یہ دنیا بھی ایک نقشِ فانی ہے یعنی ایک دن اس دنیا کو بھی ختم ہو جانا ہے۔ اس کی داستان بھی قصّۂ پارینہ بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے دنیا داری اور مادہ پرستی کے پھیر میں پڑنا دانش مندی نہیں۔ وہ تلقین کرنے کے انداز میں کہتے ہیں کہ اگر چہ یہ دنیا فانی ہے پھر بھی جب تک تم اس دنیا میں زندہ ہو یعنی جب تک تم یہاں سانسیں لے رہے ہو اُس وقت تک بددل یا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب کسی بڑے یا اہم کام کی شروعات کرو تو اُس کام کو نہایت تندہی، لگن اور محنت و مشقّت کے ساتھ انجام تک اس طرح پہنچانے کی کوشش کرو کہ تمہاری ہر سانس عمرِ جاوداں ہے۔

اے علم! کیا ہے تُو نے مُلکوں کو نہال غائب ہوا تُو جہاں سے، وہاں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح جن قوموں نے ٹھہرایا تجھے راس المال

حالؔی نے علم و ہنر کی اہمیت پر متعدد رباعیاں کہی ہیں۔ اُنہوں نے ساتویں رباعی میں علم کی اہمیت وعظمت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جن ملکوں یا قوموں نے علم کی اہمیت وعظمت کو سمجھا اور اُنہوں نے علم حاصل کیا اُنہیں نے ترقّیاں بھی کیں اور وہی خوش اقبال ہوئے۔ جن قوموں نے علم کی قدر نہیں کی وہ تباہ و برباد ہو گئیں یا پھر دنیا میں اُن کی کوئی حیثیت یا پہچان باقی نہیں رہی۔ جن قوموں نے علم کی قدر کی وہ نہ صرف بامِ عروج پر پہنچیں بلکہ غیب کے راز بھی اُن پر منکشف ہوئے اور دنیا کی تمام نعمتیں بھی اُنہیں کے حصّے میں آئیں۔ غرض حالی کے نزدیک علم و ہنر ہی ابدی سرمایہ اور نعمتِ غیر مترقبہ ہے۔ علم ہی سے دین و دنیا سنورتے ہیں اور اُسی کی برکتوں سے دونوں جہاں کی آسائش ہے۔

اک مردِ توانا کو جو سائل پایا کی مَیں نے ملامت اور بہت شرمایا
بولا کہ ”ہے اِس کا اُن کی گردن پہ وبال دے دے کے جنہوں نے مانگنا سکھلایا“

حالؔی کی آٹھویں رباعی مکالمہ کے انداز میں ہے۔ اُنہوں نے اس رباعی کے ذریعہ روزمرّہ پیش آنے والے مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ کی طرف توجّہ مبذول کرائی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مَیں نے ایک توانا یعنی تندرست شخص کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھ کر اُس کی ملامت کی اور اُس سے کہا کہ تُو تندرست و توانا ہو کر بھی گدائی کرنے کے لئے کیوں مجبور ہے۔ محنت و مشقّت کر کے روزی کیوں حاصل نہیں کرتا؟ ندامت کا احساس کرتے ہوئے اُس نے کہا: اس کے ذمّہ دار وہ افراد ہیں جنہوں نے مجھے بھیک دے دے کر مانگنا سکھایا ہے یعنی مذمّت اُن کی کرنا چاہیے جو ضرورت مندوں کے بجائے ہر تنومند اور ہر ہاتھ پھیلانے والے کو بھیک کی شکل میں کچھ نہ کچھ دے کر اُسے بھیک مانگنے کا عادی کر دیتے ہیں۔

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ”ہے جہنم دنیا“ وہ آئیں اور اِس بہشت کی سیر کریں

حالؔی نے نویں رباعی کے توسط سے صلحِ کُل کا پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ اُنھوں نے اس رباعی میں کہا ہے کہ ہندوؤں سے لڑنے میں عافیت ہے اور نہ مجوسیوں سے عداوت کرنے میں بھلائی ہے۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مذہب، فرقہ، جماعت، علاقہ، ذات پات وغیرہ کی بنیاد پر کسی سے لڑنا، خصومت رکھنا یا دشمنی کرنا انسانیت کے منافی ہے۔ اپنے دین یا مذہب پر قائم رہتے ہوئے دوسروں کے مذہب کا احترام کرنے سے باہمی منافرت ختم ہو جاتی ہے۔ ہر مذہب اور ہر باشعور شخص شر اور فساد سے بچنے اور کارِ خیر یا بھلائی کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس لئے شر اور فساد کے بجائے کارِ خیر کرنے ہی میں بھلائی ہے۔ حالؔی مزید کہتے ہیں کہ جو لوگ دنیا کو جہنّم سے تعبیر کرتے ہیں وہ آئیں اور اس بہشت نما دنیا کا نظارہ کریں۔ حالؔی کے نزدیک یہ دنیا اُسی وقت بہشت کا نمونہ بن سکتی ہے جب لوگ عداوت، خصومت اور دشمنی کو ترک کر کے باہمی ربط و تعلّق اور ہم آہنگی و قومی یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔

احساں کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو — تو اُس سے یہ بہتر ہے کہ احساں نہ کرو
کرتے ہو اگر احسان تو کر دو اُسے عام — اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

حالؔی نے دسویں رباعی میں احسانِ بے منّت کے موضوع کو آسان الفاظ میں بیان کیا ہے۔ احسان کے صلہ کی خواہش کرنے والے محسنوں کو مخاطب کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ اگر تمہیں احسان کے بدلے کی تمنّا ہے تو تم کسی پر احسان نہ کرو کیوں کہ جس پر احسان کیا جاتا ہے اُس کی نگاہیں اپنے محسن کے سامنے ہمیشہ نیچی رہتی ہیں یا پھر اُس کا سر احسان کے بار سے جھک سا جاتا ہے۔ اس لئے ایسے احسان کرنے سے احسان نہ کرنا بہتر ہے۔ اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی تم احسانِ بے منّت کے خواہاں ہو تو اس قدر یا اس طرح احسان کرو کے کسی کو یہ نہ پتہ چلے کے تم واقعی اُس پر احسان کر رہے ہو یعنی احسان کو اتنا عام کر دو کہ اس دنیا میں کوئی ممنون نہ ہو۔

04.07 خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

یاد اُس کی یہاں وِردِ مدام اپنا ہے — خالی نہ ہو کبھی، وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اُس کا — کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے

﴿۲﴾

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ — تنہا تھے پہ اَعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
''مَیں اور اطاعتِ یزیدِ گُم راہ!! — لا حولَ ولا قوۃَ اِلا با للہ''

﴿۳﴾

مَرنے پہ مِرے وہ روز و شب روئیں گے — جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
اُلفت پہ، وفا پہ، جاں نثاری پہ مِری — آگے نہیں روئے تھے تو اب روئیں گے

﴿۴﴾

توفیق نے اُس کی چھوڑ دی ہم راہی — اقبالؔ پہ جس نے فتح یابی پائی
حالؔی لے جائے کون بازی اُن سے — ہے جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی

﴿۵﴾

ہو عیب کی خُو یا ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چُھٹتے ہی چُھٹے گا اُس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت؟

﴿۶﴾

آہیں پیری میں شیخ بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گزرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اِس طرح وہ مَرتے نہیں یوں

﴿۷﴾

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل
اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اَجل
کی عرض یہ اک سیٹھ نے اُٹھ کر کہ ''حضور!!
ہے ٹیکس کا وقت بھی اِسی طرح اَٹل''

﴿۸﴾

جیسا نظر آتا ہوں نہ اَیسا ہوں مَیں
اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں مَیں
اپنے سے بھی عیب ہُوں چھپاتا اپنے
بس مجھ کو ہی معلوم ہے، جیسا ہوں مَیں

﴿۹﴾

قانون ہیں بیش تَر یقیناً بے کار
حاشا کہ ہو اُن پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت اِن کی
اور بَد نہیں بنتے نیک اِن سے زِنہار

﴿۱۰﴾

حق بول کے اہلِ شَر سے اَڑنا نہ کہیں
بھڑکے گی مدافعت سے اور آتشِ کیں
گر چاہتے ہو کہ چپ رہیں اہلِ خلاف
جُز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

﴿۱۱﴾

جوشِ خُمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حاؔلی میں ہوا
تسلیمؔ نے دی کچھ اِس طرح دادِ سخن
مجھ کو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

﴿۱۲﴾

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے نہ صواب
زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دُوں ہمت!
سائل کے سوال سے تِرا تلخ جواب

﴿۱۳﴾

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے، چکھ کے، دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بُھوک!
جو تُو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

﴿۱۴﴾

اب ضعف کے پنجے سے نکلنا معلوم
پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہے محال
آیا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

﴿۱۵﴾

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں
نعمت نہ خدا کی رائیگاں یوں کھوئیں
گر بُخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں، بہتر ہے
اِس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

﴿۱۶﴾

غصے پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں
جب تک کہ رہے وہ عقل و دانش کے قریں
آپے سے جب اپنے ہو گیا تُو باہر
پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تُو تُو ہی نہیں

﴿۱۷﴾

کرتے ہیں سفیہ اگر مذمت تیری
کر شُکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں گر وہ(نصیبِ اَعدا)
رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

﴿۱۸﴾

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر
انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیّتِ شب اُٹھا چکے اب حاؔلی!
مجلس کرو برخاست ، ہوا وقتِ سحر

﴿۱۹﴾

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا
زَردار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی محک
ہے جوہرِ انساں کی کسوٹی سونا

﴿۲۰﴾

ہر چند کہ بُرا ہے عشق کا سب سے مآل
پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بد فال
سلطان ہے اگر ظلِ الٰہی تو عشق
ہے ظلِ الٰہی کے لئے وقتِ زوال

04.08 خلاصہ

خواجہ الطاف حُسین حاؔلی کی ولادت ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں ہوئی تھی۔ اُنھیں ابتدا میں قرآن شریف کا درس دیا گیا پھر انہوں نے وہیں کے کئی علما سے اُردو، فارسی اور عربی سیکھی۔ ۱۷رسال کی عمر میں اُن کا نکاح اسلام النساء کے ساتھ کرا دیا گیا۔ ایک روز وہ کسی کو بتائے بغیر تحصیلِ علم کے لئے دلّی آ گئے اور جامع مسجد کے قریب ایک مدرسہ میں داخل ہو گئے۔ وہ اُن دنوں دلّی کے مشاعروں اور ادبی مجلسوں میں بھی شرکت کرتے تھے۔ اُنھوں نے اُسی زمانے میں غالبؔ کی شاگردی بھی اختیار کی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد اُن کے عزیز واقارب اُنھیں دلّی سے پانی پت لے آئے۔ گھر کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہونے کے سبب اُنھیں حصار، لاہور، دلّی وغیرہ میں ملازمتیں کرنا پڑیں۔

غالبؔ وشیفتہ کی صحبتوں اور دلّی کے ادبی ماحول نے اُن کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ پنجاب بُک ڈپو میں انگریزی سے ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی عبارت کو درست کرنے کے سبب اُنھیں انگریزی اور مغربی ادب سے واقفیت ہو گئی۔ اُنھوں نے لاہور میں محمّد حُسین آزاد کے نئے طرز کے مشاعروں میں کئی بہترین نظمیں پڑھیں جس سے جدید شاعری کے لئے راہ ہموار ہوئی۔ اُنھوں نے سرسیّد احمد خاں کی استدعا پر اپنی شہرہ آفاق نظم ''مسدّسِ مدّ وجزرِ اسلام'' لکھی جو ''مسدّسِ حاؔلی'' کے نام سے بھی مشہور ہے۔ اُنھوں نے مجالس النساء، مقدّمہ شعروشاعری، حیاتِ سعدؔی، حیاتِ جاوید اور یادگارِ غالبؔ جیسی اہم کتابیں لکھ کر اُردو کے نثری سرمایہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ ۳۱؍دسمبر، ۱۹۱۴ء کو پانی پت میں اُن کی وفات ہو گئی۔

حاؔلی کو بچپن ہی سے شعروشاعری کا شوق تھا۔ اُنھوں نے ابتدا میں قدما کے رنگِ سخن میں غزلیں کہیں جن میں معاملاتِ حُسن وعشق، رندی ومستی اور انفرادیت وداخلیت کو پوری طرح محسوس کیا جا سکتا ہے لیکن وہ جلد ہی اپنے دَور کے حالات ومسائل سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی بعد کی غزلوں میں اخلاقی اور مصلحانہ رنگ کی جلوہ گری ہے۔ حاؔلی نے ''مسدّسِ مدّ وجزرِ اسلام'' کے علاوہ بہت سی نظمیں لکھی ہیں۔ برکھارُت، مناجاتِ بیوہ، شکوۂ ہند، مناظرہ رحم وانصاف، حُبِّ وطن، چُپ کی داد، نشاطِ اُمّید کا شمار اُن کی بہترین نظموں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی بیش تر نظمیں زبان وبیان کے اعتبار سے عام فہم، سلیس اور دل کش ہونے کے ساتھ زندگی کے حالات ومسائل اور عوام کے رجحانات کی ترجمان ہیں۔

اگرچہ حاؔلی نے غزلوں اور نظموں کے مقابلے میں رباعیاں کم کہی ہیں مگر اُنھیں فطری طور پر رباعیاں کہنے میں مہارت حاصل تھی۔ اُنھوں نے دیگر اصنافِ سخن کی طرح اپنے خیالات اور مشن کی تبلیغ وترویج کے لئے رباعیات کو بھی ذریعہ بنایا۔ اُن کی بیش تر رباعیات کے موضوعات روایتی بھی ہیں اور حالاتِ حاضرہ کے عکّاس بھی۔ مذہب وتصوف، فلسفہ وحکمت، تعلیم وتربیت، پند وموعظت، کردار واخلاق، مُلک وملّت، مشقّت وعمل، تمدّن ومعاشرت اور ادب وسیاست وغیرہ کے موضوعات پر حاؔلی نے بہترین رباعیاں کہی ہیں۔ مگر اُن کی بیش تر رباعیوں میں اخلاقی واصلاحی پہلو زیادہ نمایاں ہیں۔ اُنھوں نے ہندوستانی عوام کی زبوں حالی اور ملّتِ اسلامیہ کے زوال پر آنسو بہانے کے بجائے اپنی رباعیوں کے ذریعہ اُنھیں جمود وقنوطیت کے دائرے سے نکل کر عزم واستقلال، محنت ومشقت اور ہمت وجرأت کے ساتھ زندگی گزارنے کا پیغام دیا ہے۔ اُن کی متعدد رباعیاں حالاتِ حاضرہ اور اپنے دَور کے مسائل کی ترجمان ہیں۔

04.09 فرہنگ

آرام دینا : سُکھ/راحت دینا،تکان اُتارنا،سُستانا،دَم لینا
آسرا اُٹھ جانا : اُمّید ختم ہوجانا،سہارا نہ رہنا،مایوس ہوجانا
آغاز کرنا : شروع کرنا،ابتدا کرنا
آنکھ کا تارا : نہایت عزیز،بہت پیارا
احساں : نیکی،اچھا سلوک،حُسن سلوک،بھلائی
اسباب : سبب کی جمع،وسیلہ،ذریعہ
اِک : ایک،واحد
انکار بن نہ آنا : کسی نہ کسی طرح تسلیم کرلینا،منظور کرلینا
انیسؔ : مشہور مرثیہ گو میر ببر علی انیسؔ
بچنا : الگ رہنا،علاحدہ رہنا،محفوظ رہنا
بڑا کام : کارِ عظیم،قابلِ تحسین کام،اہم کام
بُکا : گریۂ زاری،رونا پیٹنا
بولا : جواب دیا،کہا
بَیر کرنا : عداوت رکھنا،دشمنی کرنا،کینہ رکھنا
پَر : لیکن،اگر،اوپر
پیغامِ بُکا : آہ وزاری کی خبر،پریشانیوں کا پیام
تعبیر کرنا : توضیح کرنا،مُراد لینا
توانا : زور آور،طاقتور،قوی،ہٹّا کٹّا،تندرست
ٹھہرانا : مقرر کرنا،تسلیم کرنا،ماننا،قبول کرنا
ثمر : پھل،نتیجہ
جان : حیات،زیست
جاودانی : دائمی،سرمدی،دوامی،ہمیشہ رہنے والی
جلوہ : تجلّی،نور،علامت،نشانی
جلوہ پانا : تجلّی نظر آنا

راگ گانا : گیت گانا،نغمہ سرا ہونا
روداد : قصّہ،کیفیت،حالت،حقیقت
رودادِ جہاں : دنیا کی حقیقت،کیفیتِ عالم،دنیا کی داستان
زوال آنا : تنزّلی ہونا،عروج جاتا رہنا،اِدبار آنا
سائل : سوال کرنے والا،سوالی،گداگر،بھکاری
سدّ راہ ہونا : حائل ہونا،مزاحم ہونا،مانع ہونا،روک بننا
سر ٹکرانا : مصیبت میں مارا مارا پھرنا،جاں فشانی کرنا
سکھلانا : کسی ڈھب یا راستہ پر لگانا،عادت ڈلوانا
سمجھو : جانو،خیال کرو
سِوا : علاوہ،بجز
سیر کرنا : گھومنا پھرنا،دیکھنا،نظارہ کرنا،لطف حاصل کرنا
شرمانا : نادم ہونا،شرمندہ ہونا،لجانا
صلہ : بدلہ،انعام،اجر
صنم : بُت،مورتی
عام کرنا : رواج دینا،مخصوص یا محدود نہ کرنا
عشرت : عیش ونشاط،نفسانی مسرّت،عیّاشی
عشرت کا ثمر : عیّاشی کا نتیجہ،عیش ونشاط کا انجام
عمرِ جاودانی : حیاتِ دوامی،عمر دائمی،بڑی عمر
عیش دوست : عشرت پسند،آرام طلب،نفس پرست
غائب ہونا : موجود نہ ہونا،اوجھل ہونا
قافلہ : کارواں،مسافروں یا تاجروں وغیرہ کا گروہ
قہقہہ : ٹھٹّھا،زور سے ہنسنا
کفِ پا : پَیر کا تلوا،ادنیٰ،حقیر،انسان
کہانی : حکایت،داستان،افسانہ،بے حقیقت قصّہ

جہاں	: جس جگہ، جس مقام	گبر	: آتش پرست، آگ کی پوجا کرنے والا
جہاں	: دنیا، عالم، کائنات	مانگنا	: طلب کرنا، ہاتھ پھیلانا، دستِ سوال دراز کرنا
چکّر کھانا	: گردش میں آنا، بھنور میں پھنس جانا	مَر مَر کے جینا	: جاں فشانی سے زندگی گزارنا، سخت محنت کرنا
خیر کرنا	: بھلائی کرنا، نیکی کرنا، نیک کام کرنا	مغاں	: آتش پرست، زرتشت کا پیرو
دعویٰ ہونا	: حق جتانا	مفتوح	: وا ہونا، کھولا جانا، ظاہر ہونا
دَنی	: کمینی، رذیل، کم ظرف	ملامت کرنا	: سرزنش کرنا، لعن طعن کرنا، بُرا بھلا کہنا
دنیائے دَنی	: کمینی دنیا، رذیل دنیا	ممنون	: احسان ماننے والا، شکر گزار
دَہری	: دَہریہ، ملحد، لامذہب، خدا کو نہ ماننے والا	نقشِ فانی	: مٹنے والا نشان، اشیائے ناپائیدار، بے ثبات چیز
دے دے کے	: عطا کر کر کے، پیش کر کر کے، بار بار دے کر	نہال کرنا	: خوش رمالا مال کرنا، مُراد کو پہنچانا، کامیاب کرنا
دیکھیے	: خدا جانے، واللہ اعلم، غور کیجیے، فکر مند رہیے	وادی	: گھاٹی، دو پہاڑوں بیچ کا نشیبی علاقہ
دینا	: عطا کرنا، بخشنا، پیش کرنا	واں	: وہاں کا مخفف، وہاں
راس المال	: سرمایہ، دَولت، اصل رقم، اصلی پونجی	یاد آنا	: خیال میں آنا، ذہن میں آنا

04.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ حالؔی کی ابتدائی غزلوں کی خصوصیات تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ حالؔی کی کسی نثری تصنیف کا مختصر تعارف پیش کیجیے۔

سوال نمبر ۳ حالؔی کی نظم گوئی کی کسی ایک اہم خصوصیت کی نشان دہی کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ حالؔی کی حیات و شخصیت کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر ۲ ''حالؔی بحیثیت نظم نگار'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۳ ''حالؔی بحیثیت غزل گو'' کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر ۱ : حالؔی کی پیدائش کہاں ہوئی تھی؟

(الف) سونی پت (ب) پانی پت (ج) باغ پت (د) علی گڑھ

سوال نمبر ۲ : مندرجہ ذیل میں سے کون سی کتاب حالؔی کی نہیں ہے۔

(الف) موازنۂ انیس و دبیر (ب) مقدّمہ شعر و شاعری (ج) حیات جاوید (د) یادگارِ غالبؔ

سوال نمبر۳ : اعلیٰ درجہ کی رباعیاں تخلیق کرنے کے سبب حالؔی کو کس لقب سے یاد کیا جاتا ہے؟

(الف) بُلبُلِ ہند (ب) سعدیِ ہند (ج) طوطیِ ہند (د) شاعرِ ہند

سوال نمبر۴ : حالؔی کو ریاستِ حیدر آباد دکّن سے شروع میں کتنے روپے کا وظیفہ ملتا تھا؟

(الف) ۵۰ (ب) ۷۵ (ج) ۱۲۵ (د) ۱۵۰

سوال نمبر۵ : حکومتِ وقت نے حالؔی کو کس خطاب سے نوازا تھا؟

(الف) خان بہادر (ب) فصاحتِ جنگ (ج) شاعرِ اعظم (د) شمس العلما

سوال نمبر۶ : حالؔی نے اپنی ایک رباعی میں کس شاعر کو ''دلّی کی زبان کا سہارا'' اور ''لکھنؤ کی آنکھ کا تارا'' کہا ہے؟

(الف) میر انیسؔ (ب) مرزا دبیرؔ (ج) مرزا غالبؔ (د) میر تقی میرؔ

سوال نمبر۷ : حالؔی نے کس کی استدعا پر ''مسدّس مدّ و جزرِ اسلام'' لکھی تھی؟

(الف) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ (ب) سر سیّد احمد خاں (ج) نواب محسن الملک (د) مرزا غالبؔ

سوال نمبر۸ : یادگارِ حالؔی کس کی تصنیف ہے؟

(الف) عصمت چغتائی (ب) رشید جہاں (ج) صالحہ عابد حُسین (د) قرۃ العین حیدر

سوال نمبر۹ : مندرجہ ذیل میں سے حالؔی نے ابتدا میں کون سا تخلص اختیار کیا تھا؟

(الف) تشنہ (ب) قتیل (ج) حسرتی (د) خستہ

سوال نمبر۱۰ : حالؔی کی وفات کب ہوئی تھی؟

(الف) ۱۹۰۰ء (ب) ۱۹۰۴ء (ج) ۱۹۱۴ء (د) ۱۹۴۱ء

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (ب) پانی پت

جواب نمبر۲ : (الف) موازنۂ انیس و دبیر

جواب نمبر۳ : (ب) سعدیٔ ہند

جواب نمبر۴ : (ب) ۷۵

جواب نمبر۵ : (د) شمس العلما

جواب نمبر۶ : (الف) میر انیسؔ

جواب نمبر۷ : (ب) سر سیّد احمد خاں

جواب نمبر۸ : (ج) صالحہ عابد حُسین

جواب نمبر۹ : (د) خستہ

جواب نمبر۱۰ : (ج) ۱۹۱۴ء

04.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ حالؔی بحیثیت شاعر از ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

۲۔ یادگارِ حالی از صالحہ عابد حُسین

۳۔ تذکرۂ حالی از اسمٰعیل پانی پتی

۴۔ ذکرحالی از صادق حُسین
۵۔ دیوانِ حالؔی از خواجہ الطاف حُسین حالؔی

☼

اکائی 05 اکبرؔ حسین اکبرؔ الہ آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

05.01 : اغراض ومقاصد
05.02 : تمہید
05.03 : اکبرؔ حسین اکبرؔ الہ آبادی کے حالاتِ زندگی
05.04 : اکبرؔ حسین اکبرؔ الہ آبادی بحیثیتِ رباعی گو
05.05 : رباعیاتِ اکبرؔ (اقتباس)
05.06 : رباعیاتِ اکبرؔ (تشریح)
05.07 : اکبرؔ حسین اکبرؔ الہ آبادی کی منتخب دیگر رباعیاں
05.08 : خلاصہ
05.09 : فرہنگ
05.10 : سوالات
05.11 : حوالہ جاتی کتب

05.01 اغراض ومقاصد

اکبرؔ الہ آبادی کی شخصیت اور شاعری نہایت پہلودار تھی جس کا جاننا اُردو کے ہر طالبِ علم کے لئے ضروری ہے۔آپ اس اکائی کے ذریعہ اکبرؔ کی زندگی کے حالات، اُن کی ادبی خدمات اور بالخصوص اُن کی رباعی گوئی سے اچھّی طرح واقف ہوسکیں گے۔اگر چہ اکبرؔ زندگی بھر انگریزی سرکار کے ملازم رہے مگر اُنہوں نے برٹش سرکار کے تئیں غلامانہ ذہنیت کی ہمیشہ مخالفت کی ہے۔اُنہوں نے اپنی نظموں، غزلوں، قطعات اور رباعیات کے ذریعہ نہ صرف کھُل کر اس کا اظہار کیا ہے بلکہ طنز وظرافت کے پیرایے میں بڑی خوش اسلوبی سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ اور جھنجھوڑنے کی بھی کوشش کی ہے۔

اکبرؔ کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کے علاوہ اُن کی رباعیات کے تفصیلی مطالعہ سے نہ صرف آپ رباعی کے فن سے واقف ہوں گے بلکہ آپ کی زبان فہمی میں بھی کسی قدر اضافہ ہوگا اور آپ رباعی گوئی کی فضا سے بھی ہم آہنگ ہوسکیں گے۔اس اکائی میں اکبرؔ کی دس رباعیات کا متن پیش کیا جارہا ہے اور اُن کے مطالب ومفاہیم کی وضاحت کی جائے گی۔رباعیات کے مطالب ومفاہیم اور اُن کی خصوصیات کی روشنی میں اکبرؔ کے اندازِ بیان سے بھی واقفیت کرائی جائے گی اور ساتھ ہی یہ بھی کوشش کی جائے گی کہ آپ کو اُن کی دیگر رباعیوں کے مفاہیم کو سمجھنے میں زیادہ دشواریاں نہ ہوں۔

05.02 تمہید

اگر آپ نے اکبرالہ آبادی کی حیات وشاعری کے بارے میں تھوڑا سا بھی مطالعہ کیا ہوگا تو آپ کو یہ پتہ ضرور ہوگا کہ جب اکبر کی شاعری کے متعلّق گفتگو کی جاتی ہے تو اُن کے طنزیہ اور ظریفانہ رُخ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ اکبر نے غزلیں بھی کہی ہیں اور نظمیں بھی، قطعات بھی کہے ہیں اور رباعیات بھی کہی ہیں، قصیدے بھی کہے ہیں اور مرثیے بھی، مسدّس اور ترکیب بند پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ طنزیہ اور ظریفانہ شاعری کے ثبوت میں قطعات ور باعیات کی بہ نسبت اُن کی غزلوں اور نظموں کے اشعار خوب پیش کیے جاتے ہیں جب کہ اُن کے قطعات اور اُن کی رباعیات کی بھی اہمیت کسی طرح کم نہیں ہے۔ اکبرالہ آبادی کی رباعیات کے مضامین متنوع، رنگارنگ اور نہایت دل چسپ ہیں جن میں طنز ومزاح اور ظرافت بھی ہے، نظریات وتصوّرات بھی ہیں اور ہلکے پھُلکے پند ونصائح بھی ہیں، مشرقی تہذیب واقدار کی زبوں حالی کا درد بھی ہے اور مغرب زدگی سے بچانے کی کوشش بھی ہے، قومی مسائل بھی ہیں اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرے بھی ہیں۔

دراصل اُن کی نظموں کی طرح رباعیاں بھی فلسفہ واخلاق سے لبریز مفید اور سبق آموز طنز وتفنن کی آئینہ دار ہیں۔ ہم جس دل چسپی اور ذوق وشوق سے اکبر کی غزلوں اور نظموں کا مطالعہ کرتے ہیں اُسی دل چسپی اور گہرائی وگیرائی سے اُن کی رباعیوں کے مطالعہ کی بھی ضرورت ہے تبھی ہم اکبر اور اُن کی شخصیت وفن کو بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ اسی مقصد کے تحت آپ کے نصاب میں اکبر کی دس رباعیوں کو شامل کیا گیا ہے اور اُن کے مطالب ومفاہیم کے ذریعہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ آپ رباعی کے فن سے اچھّی طرح واقف ہو جائیں۔ اس کے علاوہ اکبر کی دیگر رباعیوں کے ساتھ اُردو کے دوسرے شعرا کی رباعیوں کو سمجھنے اور اُن کا تجزیہ کرنے میں بھی مدد مل سکے۔

05.03 اکبر حُسین اکبرالہ آبادی کے حالاتِ زندگی

اکبر کا شمار اُردو کے نام وَر شعرا میں کیا جاتا ہے۔ اُنہیں بچپن ہی سے شعر وشاعری کا شوق تھا۔ اُن کی طبیعت میں شوخی وظرافت پوری طرح رچی بسی ہوئی تھی۔ اُنہوں نے شروع میں روایتی انداز میں طبع آزمائی کی اور اسی لہجے میں بہت سی غزلیں بھی کہی ہیں لیکن کچھ عرصہ کے بعد قدیم طرزِ فکر کو ترک کر کے وہ اپنے مخصوص لہجے میں شعر کہنے لگے جو رفتہ رفتہ اُن کی پہچان بھی بن گیا۔ اگر عہدِ اکبر کو تغیرات اور تبدیلیوں کا دَور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ لوگ احساسِ کمتری میں اس قدر مبتلا تھے کہ مشرقی تہذیب کو ترک کر کے انگریزوں کی تقلید کو فیشن کے طور پر اپنا رہے تھے۔ مذہب سے بیگانگی کے سبب ہندوستانی اور خصوصاً اسلامی تہذیب خطرے میں پڑ گئی تھی۔

انگریزی سرکار کے ملازم ہوتے ہوئے بھی اکبر مُلک وقوم کی حالتِ زار سے بے خبر نہیں تھے۔ اُن کی رگ وپے میں مُلک وقوم کی محبت وخدمت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ باشندگانِ ہند اور بالخصوص مسلمانوں کی حالتِ تباہ کو بہت قریب سے محسوس کر رہے تھے۔ اُنہیں مشرقی تہذیب اور اقدار کے منتشر ہونے اور مغرب کی کورانہ تقلید کرنے کا سخت ملال تھا۔ وہ یوروپ کی ہر بات اور ہر طرزِ معاشرت کو آنکھ بند کر کے یا فیشن کے طور پر قبول کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اُنہوں نے اپنی شعری صلاحیتوں یعنی اپنے کلام کے ذریعہ قوم کو مغربیت کے سیلاب سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ اُن کے ظریفانہ کلام کو پڑھ یا سُن کر پند ونصائح کی تلخی کا احساس نہیں ہوتا البتّہ درد اور کرب کو ضرور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اکبر نے اپنے دَور کے سماجی حالات، معاشرے کی زبوں حالی اور مختلف جدّ وجہد کو شعوری طور پر نہ صرف سمجھنے کی کوشش کی بلکہ اُنہیں اپنی شاعری کا موضوع بھی بنایا۔

دراصل یہ ایک طرح کی حقیقت پسندی ہی تھی جس میں آئے دن ہونے والے واقعات وحالات کو طنز وظرافت کے پیرایہ میں بڑی کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔آپ کو اس اکائی کے مطالعہ کے ذریعہ اکبر کے حالاتِ زندگی، ادبی خدمات، رباعی گوئی اور اُن کی رباعیوں کے ساتھ اُن کے مفاہیم سے بھی واقف کرایا جائے گا۔کوئی شاعر ہو یا ادیب وہ سماج کا ایک فرد ہوتا ہے۔وہ اپنے دَور کے سماجی، سیاسی، معاشی مسائل اور دیگر حالات کو بہت قریب سے دیکھتا ہے اور اُسے محسوس کرتا ہے۔وہ ماضی کی شان دار یا تاریخی روایات سے بھی واقف ہوتا ہے اور مستقبل پر بھی نظر رکھتا ہے۔اس لئے کسی شاعر یا ادیب کے کلام کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کے حالاتِ زندگی، اُس کے عہد کے ماحول و مسائل سے واقفیت ضروری ہے۔عہدِ اکبر اُنیّسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے ربع اوّل تک محیط ہے۔اس زمانہ میں افراتفری، بدامنی اور بدنظمی اپنے عروج پر تھیں۔بنیادی تغیرات اور تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔اکبر کے شاعرانہ اظہار اور اُن کے ردِعمل کو اچھی طرح سمجھنے اور اُن کے کلام کی صحیح تفہیم کے لئے اُن کے حالاتِ زندگی اور اُن کے عہد کے اہم مسائل سے واقفیت ضروری ہے۔

سیّد اکبر حُسین اکبر الہٰ آبادی کی ولادت ضلع الہٰ آباد کے قصبہ بارہ میں ۶ رنومبر ۱۸۴۶ء کو ہوئی تھی جہاں اُن کے چچا تحصیل دار کے عہدے پر فائز تھے۔اکبر کے آباواجداد ۱۶۲۳ء میں ایران کے شہر نیشا پور سے ہندوستان آئے۔اُن کے پردادا سیّد محمد زماں ریاستِ بنگال کے صوبہ دار تھے اور پلاسی کی جنگ میں انگریزوں کی طرف سے شامل ہوئے تھے۔اکبر کے دادا کا نام فضل محمد اور والد کا نام سیّد تفضّل حُسین ہے۔ اُن کا بچپن ضلع شاہ آباد کے داؤدنگر میں گزرا جہاں اُن کی ابتدائی تعلیم وتربیت بھی ہوئی۔۱۸۵۵ء میں اکبر کے والد کے چچا سیّد فضل الدّین احمد کی منتقلی صدر دیوانی کلکتہ سے الہٰ آباد ہوگئی۔اُن کے ساتھ خاندان کے تمام افراد بھی الہٰ آباد آ گئے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔اکبر کے والد اور والدہ کو مذہب سے بہت لگاؤ تھا۔اُن کی والدہ نہایت نیک اور پارسا خاتون تھیں۔والد کو تصوّف سے خاص شغف تھا۔اسی لئے بچپن ہی سے اکبر کی تربیت مذہبی ماحول میں ہوئی۔اکبر کے والدین اُن کا بہت خیال رکھتے تھے۔اُن کے والد اُنہیں خود پڑھاتے اور سبق آموز نصیحتیں بھی کرتے تھے۔اس طرح اُن کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں ہوئی۔اکبر کو علم ریاضی بہت پسند تھا۔چناں چہ اُنہوں نے کمسنی ہی میں ریاضی میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر لی تھی۔

اکبر کے گھر میں محفلِ سماع اور مجالسِ عزا کا پابندی سے اہتمام کیا جاتا تھا۔اُن کے والد اُنہیں دیگر مقامات پر منعقد ہونے والی محفل سماع اور مجالسِ عزا میں شرکت کرنے کے لئے اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔اس طرح اکبر کی شخصیت اور مزاج میں مذہبی ماحول رچ بس گیا تھا۔اکبر کی عمر جب تقریباً آٹھ سال کی ہوئی تو انہیں الہٰ آباد کے ایک مکتب میں داخل کرا دیا گیا۔ایک مولوی صاحب بھی اُنہیں گھر پر پڑھانے کے لئے آتے تھے۔اکبر کی ذہانت اور پڑھائی کے شوق کے مدِّنظر اُن کے والد نے اُنہیں ۱۸۵۶ء میں الہٰ آباد کے جمنا مشن اسکول میں داخل کرا دیا۔ابھی ایک سال ہی گزرا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں جنگ چھِڑ گئی جسے انگریزوں نے غدر کا نام دیا۔اس ہنگامہ کے بعد اُن کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔اس کے بعد اُنہوں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے خیال کو ترک کر دیا اور ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔اکبر نے اپنی زندگی میں مختلف ملازمتیں کیں اور کئی چھوٹے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔اُنہوں نے اپنی ملازمت کی ابتدا کیٹ گنج منصفی، الہٰ آباد میں عرضی نویسی سے کی۔اس کے بعد محرّری سیکھنے کے لئے وہ اپنے محلّے کے ایک وکیل کے بستے میں جانے لگے جہاں اُنہوں نے محرّری میں کافی مہارت حاصل کر لی۔کچھ دنوں کے بعد محلّہ کے ایک وکیل کی کوشش اور سفارش سے اُن کے عارضی تقرری سررشتہ داری کی عوضی میں ہو گئی۔

اکبر شروع ہی سے نڈر اور بے باک تھے۔ وہ نہ کسی سے مرعوب ہوتے تھے اور نہ کسی سے خوف زدہ۔ جس کے ثبوت میں اُن کی نوجوانی کے دو واقعات پیش کیے جا رہے ہیں:

﴿۱﴾ واقعہ: ایک انگریز آر.ڈبلیو.آئی.بینسن (R.W.I.Benson) الہٰ آباد میں مجسٹریٹ کے عہدے پر فائز تھے۔ ایک روز اُنھوں نے اعلان کرایا کہ جو ہندوستانی عدالت میں ملازمت کرنے کے خواہش مند ہوں وہ کل اپنی عرضی کے ساتھ اُن کی خدمت میں حاضر ہوں اور اُن سے رجوع کریں۔ چنانچہ وقت مقررہ پر بہت سے بے روزگار ہندوستانی نوجوان اپنی اپنی عرضیوں کے ساتھ مجسٹریٹ کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد کچھ لوگوں کی عرضیاں لے لی گئیں لیکن مجسٹریٹ کی خدمت میں کسی کی پذیرائی نہ ہو سکی۔ کسی کو اُن سے ملاقات کی کوئی تدبیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ آخر کسی کام سے مسٹر بینسن کو باہر آنا پڑا۔ کسی میں اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ اُن سے بات کر سکے۔ کچھ لوگوں نے اکبر کو اُکسایا کہ وہ اُن سے بات کریں۔ اکبر نے ہمّت کر کے اُن سے پوچھا کہ اُن کی ملازمت کی عرضی پر کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مسٹر بینسن نے اپنے چپراسی کو فوراً حکم دیا کہ اس گستاخ لڑکے کو پکڑ لیا جائے۔ یہ سُنتے ہی اکبر نے دَوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر چپراسی نے آخر کار اُن کو پکڑ ہی لیا۔ اس کے بعد اُنھیں امتحان دینے کا حکم دیا گیا۔ اکبر نے باقاعدہ امتحان دیا اور وہ کامیاب بھی ہو گئے۔ اس طرح وہ انگریزی سرکار کے ملازم ہو گئے۔ اُن کی یہ ملازمت بھی عارضی تھی۔ کام زیادہ ہونے کے سبب مسٹر بینسن نے اکبر کو رہنے کے لئے اپنے بنگلہ کی ایک کوٹھری دیدی اور اپنے بیرے اور خانساماں کو یہ تاکید بھی کر دی کہ وہ لوگ ان کا اچھّی طرح خیال رکھیں اور اُنھیں کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دیں۔ انگریز مجسٹریٹ مسٹر بینسن کے بنگلے میں ایک مدّت تک رہنے کی وجہ سے اکبر کو صاحب اور میم صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ اُن کی طرزِ معاشرت یعنی رہن سہن، کھانے پینے، نشست و برخاست، عادت و اطوار اور مزاج سے بخوبی واقف ہو گئے۔ چوں کہ یہ ملازمت عارضی تھی اس لئے کچھ دنوں کے بعد اُنھیں اس نوکری سے بھی سبکدوش کر دیا گیا۔ اکبر پھر نوکری کی تلاش میں ادھر اُدھر بھٹکنے لگے۔

﴿۲﴾ واقعہ: دوسری دفعہ ملازمت حاصل کرنے کے لئے اُنھیں نہایت تلخ تجربہ سے دوچار ہونا پڑا۔ وہ پہلے واقعہ ہی کی طرح ایک روز ایک انگریز افسر کے یہاں دوسری عرضی گزاروں کے ساتھ ملازمت کی درخواست پر فیصلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جب وہاں اُن کو انتظار کرتے کرتے بہت دیر ہو گئی اور وہ تھک کر چور ہو گئے تو اُنھوں نے ہمّت کر کے اُس انگریز افسر سے پوچھ لیا کہ اُن کی درخواست پر کیا فیصلہ کیا گیا ہے۔ انگریز افسر کو اُن کی یہ حرکت ناگوارِ خاطر ہوئی اُس نے طیش میں آ کر اپنے چپراسی سے کہا کہ اُن پر بلّی دَوڑا دو۔ دراصل بلّی (BILLY) اُس کے خطرناک کُتّے کا نام تھا۔ تمام اُمّید وار یعنی عرضی گزار ڈر کر بھاگ گئے مگر اکبر جو شاید عمر میں سب سے چھوٹے تھے بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہیں کھڑے رہے۔ انگریز افسر اُن کی دلیری اور بے خوفی سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُس نے اُنھیں ملازمت دے دی۔ یہ ملازمت بھی پوری طرح عارضی تھی۔

مندرجہ بالا دونوں واقعات کا اکبر کی شخصیت پر گہرا اثر پڑا۔ ملازمت کے لئے تلخ تجربوں سے گزرنے اور انگریز افسروں کی ظلم و تشدد کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکے جو بعد میں اُن کی شاعری کے موضوعات کی شکل میں رونما ہوئے۔ ۱۸۶۸ء یا ۱۸۶۹ء میں الہٰ آباد کی ایک تحصیل میں نائب تحصیل دار کے عہدے پر اکبر کی تقرری ہو گئی مگر یہ ملازمت بھی اُنھیں راس نہیں آئی۔ چند روز کے بعد وہ تخفیف میں آ گئے اور واپس

الہ آباد چلے آئے۔ کچھ دنوں کے بعد بہت کوشش اور سفارش کرنے پر اُن کی تقرری مسل خواں کی حیثیت سے ہوگئی۔ اُنھوں نے ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کرلیا اور وہ وہیں وکالت کے پیشے سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۸۸۱ء میں وہ منصف کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ اس کے بعد ۱۸۸۸ء میں ''سب ججی'' کی قائم مقامی حاصل ہوئی اور پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ ''سب جج'' ہوگئے۔ ۱۸۹۴ء میں اُن کا انتخاب سیشن جج کے عہدے کے لئے ہوگیا۔ آنکھوں کی بینائی کم ہوجانے کی وجہ سے اکبر نے قبل از وقت نوکری سے سبک دوش ہونے کا ارادہ کرلیا اور پینشن لے کر پوری طرح ادبی زندگی گزارنے لگے۔ ۱۸۹۸ء میں انگریزی سرکار نے اُنہیں خان بہادر کے خطاب سے نوازا۔

دراصل اکبر آزادانہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ معاشی تنگی سے نجات حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے مختلف ملازمتیں کیں مگر وہ پابندیوں اور نوکری کی جھنجھٹوں سے پریشان رہتے تھے جس کا ذکر اُنھوں نے اپنے دوستوں کو لکھے گئے خطوط میں بھی کیا ہے اور شاعری میں بھی۔ ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے ؎

پراگندہ بہت ہے دل مرا دنیا کے دھندوں سے چھڑا دے مجھ کو یارب! نوکری کے سخت پھندوں سے
غلامانہ طریقوں پر مجھے مجبور کرتے ہیں خدایا! بے نیازی دے مجھے اِن خود پسندوں سے

اگرچہ اکبر نے ملازمتوں کے حصول کے لئے ابتدا میں بہت پریشانیاں اُٹھائیں، دردر بھٹکے مگر کچھ عرصہ کے بعد کامیابی کی منزل سے اس طرح ہمکنار ہوئے کہ ایک سے ایک اچھے عہدے پر فائز ہوئے جہاں اُنہیں کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ شہرت بھی ملی۔ دراصل اکبر جس ملازمت سے وابستہ اور جس عہدہ پر فائز رہے اُسے اہم فریضہ سمجھ کر نہایت دیانت داری، تندہی اور مستعدی سے انجام دیتے رہے۔

اکبر کی پہلی شادی ۱۸۵۹ء میں خدیجہ بی بی کے ساتھ ہوئی تھی جب وہ ۱۳/سال کے تھے۔ خدیجہ بی بی ایک دیہاتی عورت تھیں جو اکبر کو بالکل پسند نہیں تھیں۔ اُن کے بطن سے دو بیٹے بھی ہوئے مگر دونوں میاں بیوی کے تعلّقات ہمیشہ کشیدہ رہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اکبر نے اپنی بیوی اور دونوں بیٹوں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا جب کہ بعض حضرات اکبر کی بیوی ہی کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ اُن کی بیوی نہایت چڑچڑی، بدمزاج، بے جا مطالبے اور ہنگامے برپا کرنے والی تھی۔ بہر حال دونوں میاں بیوی ایک دوسرے سے کبھی خوش نہیں رہے۔ اکبر نہایت نفاست طبع اور حُسن پرست تھے۔ اُنہیں جوانی میں رقص وسرود کا بھی شوق تھا اور اُنہیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی۔ شاید اپنی آسودگی کے لئے اُنہوں نے بوٹا جان نامی ایک طوائف سے بھی شادی کر لی تھی۔ بوٹا جان کے انتقال کے بعد اکبر نے نومبر ۱۸۷۶ء میں فاطمہ صغریٰ نامی ایک خاتون سے نکاح کر لیا۔ فاطمہ صغریٰ کے بطن سے دو لڑکے اور ایک لڑکی عالمِ وجود میں آئے۔ بڑے بیٹے کا نام عشرت حُسین اور چھوٹے بیٹے کا نام محمد ہاشم تھا۔ بیٹی کا کمسنی میں انتقال ہوگیا تھا اور چھوٹے بیٹے کی بھی چودھ پندرہ سال کی عمر میں وفات ہوگئی تھی۔

اکبر نے اپنے بڑے بیٹے عشرت حُسین کی تعلیم وتربیت پر بہت توجّہ دی۔ اُنہیں پڑھنے کے لئے انگلستان بھجوایا مگر انگلستان میں وہ مغربی اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے اور پوری طرح انگریزی تہذیب میں رچ بس گئے جس کا اکبر کو آخری دم تک ملال رہا۔ اکبر کی آخری زندگی نہایت کسمپرسی میں گزری۔ عشرت حُسین کے علاوہ بیوی بچّوں کی وفات ہوچکی تھی۔ عشرت حُسین انگلستان کی رنگ رلیوں میں دل چسپیاں لینے لگے تھے۔ وہ ایک انگریز لڑکی کے حُسن پر فریفتہ ہوگئے تھے۔ اس لئے اکبر نہایت دل برداشتہ سے رہنے لگے تھے۔ ۹/ستمبر ۱۹۲۱ء کو لسان العصر اکبر الہ آبادی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

05.04 اکبر حُسین اکبرالہ آبادی بحیثیت رباعی گو

آپ اب تک کے مطالعہ سے اکبرالہ آبادی کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری کی خصوصیات سے اچھّی طرح واقف ہو گئے ہوں گے۔اگر اکبر کے مجموعی کلام کے مطالعہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی جائے تو پتہ چلے گا کہ اُنہوں نے ابتدا میں روایتی غزلیں خوب کہی ہیں پھر حالتِ حاضرہ کے تقاضوں کے تحت اُن کے غزلیہ کلام میں مقصدیت کے عناصر رونما ہونے لگے تھے۔اسی مقصدیت اور معاشرہ کی اصلاح کے سبب اُن کا رجحان مختصر نظموں، مختصر قطعات، فردیات اور رباعیات کی طرف بڑی تیزی سے بڑھنے لگا۔دراصل اکبر زود گو شاعر تھے۔وہ اپنے عہد کے ہر اہم اور غیر اہم مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کا اظہار شعری پیرایے میں کر کے ہی دم لیتے تھے۔

آپ اس سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ اکبر کی شاعری کا ایک بڑا حصّہ طنزیہ و مزاحیہ ہے۔ظرافت اُن کے کلام کی جان ہے۔اسی لئے اُن کا پیرایۂ بیان اُن سے تقاضہ کرتا تھا کہ وہ اپنے دل کی بات لطافت کے ساتھ چٹکلوں کے انداز میں ادا کریں۔لگاتار یا تسلسل کے ساتھ کسی بات کو بیان کرنا قاری اور سامع کے ذہن و دل پر بار کا سبب بن جاتی ہے اور ہنسی کو بہت دیر تک ضبط کرنے میں اُس کا اثر بھی بڑی حد تک زائل ہو جاتا ہے۔پڑھنے یا سُننے والے چاہتے ہیں کہ جملہ یا بات ختم ہوتے ہی اُن کو ہنسی آ جائے اور پیش کرنے یا سنانے والا بھی یہی چاہتا ہے کہ اُس کی بات یا اُس کے شعر کی داد بھی جلد مل جائے۔شاید انہیں باتوں کے مدّ نظر اکبر نے غزلوں کے علاوہ مختصر نظمیں، چھوٹے چھوٹے قطعات، فردیات اور رباعیات کی طرف زیادہ توجّہ دی ہے تاکہ لوگوں کے ذہن پر زیادہ بار نہ پڑے اور وہ اپنے مقصد میں بھی کامیاب ہو جائیں۔

اگر چہ اُردو کے بیش تر شاعروں نے رباعیات کہی ہیں لیکن مجموعی طور پر اس صنف سخن کی طرف دیگر اصناف کے مقابلے کم توجّہ دی گئی ہے۔اس کی اصل وجہ رباعیات کے مخصوص ارکان ہیں جن پر طبع آزمائی کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔صرف دو شعر یعنی چار مصرعوں میں اپنی بات کو مکمّل کرنا ہوتا ہے۔اس کا آخری مصرع رباعی کی جان ہوتا ہے یعنی جس کے لئے رباعی کہی جاتی ہے۔رباعیات کے خاص موضوعات اخلاق، مذہب، تصوف، پند و موعظت، دنیا کی بے ثباتی اور مناظرِ فطرت ہیں لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد شاعروں نے رباعیات میں حالاتِ حاضرہ سے متعلّق مسائل کو نظم کرنے کی ابتدا کی اور اُسے اپنے پیام کا ذریعہ بھی بنایا۔

اکبرالہ آبادی نے اگر چہ غزلیہ اور نظمیہ شاعری کے مقابلے میں رباعیاں کم کہی ہیں مگر اُن کا شمار ممتاز رباعی گو شعرا میں کیا جاتا ہے۔اُنہوں نے رباعیات کے روایتی مضامین جیسے بے ثباتیِ دنیا، مذہب، تصوف، اخلاق اور مناظرِ فطرت کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کے مسائل کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔اکبر کی وہ رباعیاں نہایت اہمیت کی حامل ہیں جن میں اُنہوں نے سیاست، سماج، اخلاق اور مذہب سے متعلّق مضامین نظم کیے ہیں۔اُنہوں نے اپنی رباعیات میں اخلاقی اور اصلاحی پہلو پر بہت زیادہ زور دیا ہے۔اُنہوں نے قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے اور مغربی تہذیب کی اندھا دُھند تقلید سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے متعدد رباعیاں کہی ہیں۔چند رباعیات پیش ہیں:

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے اُٹھا ہے قلم گُہر فشانی کے لئے
آیا ہوں مَیں کوچۂ سخن میں اکبر نظارۂ شاہدِ معانی کے لئے

☆

جب لطف و کرم سے پیش آئے محبوب | اگلے رنجوں کو بھول جانا اچھا
جب مثلِ نسیم وہ گلے سے لگ جائے | مانند کلی کے، پُھول جانا اچھا

☆

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا | افعالِ مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا
اکبؔر نے سنا ہے اہلِ غیرت سے یہی | جینا ذلت سے ہو تو مَرنا اچھا

☆

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چُھرا | عیاشی ہے بدی کے پہیے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری | گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

☆

گزرا ہے مِری نظر سے سب کا جلوہ | سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم، عجم میں جم ہے موجود | کہہ دو کہ عرب میں دیکھ رب کا جلوہ

میر انیؔس اور خواجہ الطاف حُسین حالؔی کی طرح اکبؔر کی متعدد رباعیاں مذہب واخلاق سے متعلّق ہیں جن میں پند وموعظت کو نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔اُنھوں نے ایسی رباعیات کے ذریعہ اپنے ہم وطنوں کو پستی و بدحالی سے نجات دلانے، اعلیٰ کردار و بلند اخلاق پیدا کرنے، ہمّت وجرأت، جوش واستقلال اور محنت ومشقّت اور دیانت داری سے کام کرتے رہنے کی ترغیب دی ہے۔اُن کی رباعیات نے قوم کو احساسِ کمتری سے بچانے، جمود وقنوطیت کے حصار سے نکالنے، حرکت وعمل اور رجائیت کے جذبات کو بیدار کرنے کا اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔چند رباعیاں پیش ہیں۔

اُونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا | احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبؔر | لیکن ہے شدید عیب، کینہ رکھنا

☆

کہہ دو کہ مَیں خوش ہوں، رکھوں گر آپ کو خوش | بجلی چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش
سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے | ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

☆

ہر چند محلِ انقلابات رہا | گھٹنے بڑھنے کا پیچ دن رات رہا
چھوڑی نہیں منزلیں قمر نے اپنی | ذی رتبہ و صحبِ مقامات رہا

☆

راحت کا سماں بندھا تو غفلت بھی ہوئی | حسرت کا کھنچا جو سین، عبرت بھی ہوئی
دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبؔر | بس اُس کے مطابق اُس کی حالت بھی ہوئی

اکبرؔ کی رباعیوں میں مذہبی احکامات اور مذہبی معاملات کا ذکر بار بار آتا ہے۔ وہ مذہب سے بیگانگی پر اظہارِ افسوس بھی کرتے ہیں اور جدید وضع اختیار کرنے والوں پر طنز کے تیر بھی چلاتے ہیں۔ وہ مذہب کو صرف مساجد اور مجالس تک محدود رکھنے کے قائل نہیں۔ چوں کہ اکبرؔ کو تصوف سے گہرا لگاؤ تھا اور علاّمہ اقبالؔ نے تصوف پر کچھ اعتراضات کیے تھے، اس لئے وہ اُن سے خفا ہو گئے تھے۔ وہ سر سیّد احمد خاں کے مذہبی نظریات اور اصلاحات سے بھی متفق نہیں تھے۔ اُنہوں نے مُلک وقوم کے لئے تجدّد اور ترقّی پسندی کی علامت سر سیّد احمد خاں کی تحریک پر کھُلے طور پر تنقید کر کے نہایت ہمّت وجرأت کا ثبوت دیا ہے۔ حالاں کہ بعد میں وہ سر سیّد احمد خاں کے تعلیمی نظریات اور اُن کے مشن کی حمایت کرنے لگے تھے۔ پیش ہیں چند رباعیاں۔

آزاد سے دین کا گرفتار اچھا
شرمندہ ہو دل میں وہ گنہ گار اچھا
ہر چند کہ زُور بھی ہے اک خصلتِ بَد
واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

☆

تھا سَر میں کمال وہ سلطان بنا
تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا
تھا پیٹ بہت حریص، شیطان بنا

☆

مذہب کو لیا تو بحث میں سَر ٹُوٹا
چاہی اصلاح تو خدا ہی چُھوٹا
شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبرؔ
قسمت ہی نے ہم کو ہر طرح سے لُوٹا

☆

مجلس میں خیالِ بادہ نوشی پایا
مکتب میں سرِ سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ اَمن تھا اے اکبرؔ!
لیکن اک عالمِ خموشی پایا

اکبرؔ کی رباعیوں میں سنجیدگی بھی ہے، شوخی وظرافت بھی ہے اور طنز بھی جو ہر لحاظ سے قابلِ قدر اور اپنے دَور کی آئینہ دار ہیں۔ اُن کی رباعیوں کی نمایاں خوبی خلوص، صداقت اور صاف گوئی ہے۔ اکبرؔ کا مقصد قوم کے ہر فرد تک اپنے پیغام کو پہنچانا اور اُن کی اصلاح کرنا تھا۔ اسی لئے اُن کی بیش تَر رباعیوں کی زبان آسان اور عام فہم ہے۔ مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اکبرؔ کی رباعیاں اندازِ بیان، لفظیات اور موضوعات کے اعتبار سے نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

05.05 رباعیاتِ اکبرؔ (اقتباس)

﴿۱﴾

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا
غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن
کم تھیں بہ خدا کہ جن کو بینا پایا

﴿۲﴾

فرمائیں مِرا قصور حضرت جو معاف　تو اَمر ہے واقعی، گزارش کروں صاف
انکار نہیں نماز، روزے سے مجھے　لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

﴿۳﴾

پیری آئی، ہوئی جوانی رخصت　ساتھ اُس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اِسی کا انتظار اے اکبؔر　ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

﴿۴﴾

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو　بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اک دن اور اُڑ جائے گی بھاپ　دیکھنا اکبؔر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

﴿۵﴾

دنیائے دَنی کی یہ ہوس جانے دو　گل چیں ہو اگر تو خار وخس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ　اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

﴿۶﴾

حاسد تجھ پر اگر حسد کرتا ہے　کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس　اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

﴿۷﴾

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا　اِس باغ میں کیا دَھرا ہے پھندے کے سوا
گل چیں ہے ہر اک، نہیں ہے بُلبُل کوئی　اِس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

﴿۸﴾

آگاہ ہوں معنیِ خوش اقبالی سے　واقف ہوں بِنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبؔر　چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

﴿۹﴾

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پَخ　اور شیخ کے گھر میں پنج گانے کی ہے پَخ
بہتر تو یہی ہے کہ بُت پرستی کی جے　گو اِس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پَخ

﴿۱۰﴾

سیّد صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور　کہتا نہیں تم سے مَیں کہ ہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا اُنہوں نے لیکن　اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

05.06 رباعیاتِ اکبر(تشریح)

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا   غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن   کم تھیں بہ خدا کہ جن کو بینا پایا

آپ کے نصاب میں شامل پہلی رباعی میں بھی اکبر نے طنزیہ پیرایے میں کہا ہے کہ اس دنیا کے زیادہ تر انسان غافل یعنی بے خبر ہیں وہ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں یعنی اُنہیں نہ اپنا ہوش ہے اور نہ اپنے مستقبل کا۔ وہ کہتے ہیں کہ بظاہر آنکھیں تو بہت ہیں لیکن ایسی آنکھیں بہت کم ہیں جن میں روشنائی یا بینائی ہو۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آنکھ والے تو بہت ہے مگر بینا یعنی ہوش مند افراد تعداد میں بہت کم ہیں۔

فرمائیں مِرا قصور حضرت جو معاف   تو اَمر ہے واقعی، گزارش کروں صاف
انکار نہیں نماز، روزے سے مجھے   لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف

اکبر دوسری رباعی میں بھی طنز کے نشتر چبھوتے ہوئے کہتے ہیں کہ مَیں نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے سے انکار نہیں کر رہا ہوں۔ اگر آپ مجھے صاف صاف کہنے کی اجازت دیں تو مَیں یہ ضرور عرض کروں گا کہ روزہ نماز یا تمام مذہبی احکامات کی پابندی اس دَور میں فیشن کے خلاف ہے۔ دراصل وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ مغربی تہذیب کو فیشن کے طور پر اپنانے والے روزہ، نماز اور دیگر مذہبی امور کو اپنی شان کے خلاف تصور کرنے لگے ہیں۔

پیری آئی، ہوئی جوانی رخصت   ساتھ اُس کے وہ لطفِ زندگانی رخصت
ہے اب تو اِسی کا انتظار اے اکبر   ہم کو بھی کرے جہانِ فانی رخصت

اکبر نے تیسری رباعی میں ایک روایتی مضمون کو نظم کیا ہے۔ اُن کی یہ رباعی اُن کے زمانۂ پیری کی ہے کیوں کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ جوانی ڈھلنے کے ساتھ زندگی کا لطف بھی ختم ہو گیا ہے یعنی عیش وعشرت کا زمانہ جاتا رہا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری ایّام میں بہت مایوس اور پریشان رہنے لگے تھے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں کہ جب زندگی بے لطف اور بے کیف ہوگئی ہے تو زندہ رہنے سے کیا فائدہ؟ اب تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روح تن سے جدا ہو جائے اور لوگ مجھے اس دارِفانی سے رخصت کریں۔

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو   بس خدا سمجھا ہے اُس نے برق کو اور بھاپ کو
برق گر جائے گی اکدن اور اُڑ جائے گی بھاپ   دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

اکبر نے چوتھی رباعی میں مغربی سائنس دانوں پر طنز کرتے ہوئے کہا ہے کہ اُنہوں نے اپنی ایجادات کے زعم میں آسمانی باپ یعنی اللہ تعالیٰ جو قادرِ مطلق ہے کو فراموش کر دیا ہے۔ وہ بجلی اور بھاپ کو خدا یعنی سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ دراصل وہ خدا اور اُس کی قدرتِ کاملہ سے منحرف ہو گئے ہیں اور اپنی ایجادات ہی کو ترقّی کا زینہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ پیشین گوئی کے انداز میں خود کو مخاطب کرتے ہوئے لوگوں کو ہوشیار کر رہے ہیں کہ وہ یوروپ کی سائنسی ایجادات کے پھیر میں پڑ کر قادرِ مطلق کو نہ بھلا دیں کیوں کہ ایک دن نہ بجلی ہوگی اور نہ بھاپ، دنیا کی ہر چیز تباہ و برباد ہو جائے گی۔ اس لیے لوگ اپنے ایمان کو سلامت رکھّیں۔

دنیائے دَنی کی یہ ہوس جانے دو   گل چیں ہو اگر تو خار وخس جانے دو
مالک کے بغیر گھر کی رونق نہیں کچھ   اللہ کو اپنے دل میں بس جانے دو

اکبرنے پانچویں رباعی دنیاداروں اور مادہ پرستوں کے لئے کہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رذیل دنیا کبھی کسی کی نہیں ہوئی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک دنیادار اسی زمین میں سماتے چلے گئے ہیں۔ باغباں جس طرح پودوں کی حفاظت کرنے کے لئے خاروخس یعنی بے سود گھانس کو اُکھاڑ کر پھینک دیتا ہے اُسی طرح اپنے دل سے دنیا کی ہوَس کو نکال کر اور اللہ تعالیٰ کو بسا کر اپنے دل کو منوّر کر لینا چاہیے۔ دراصل اکبر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ آلائشِ دنیا سے جب تک دل پاک وصاف نہ ہوگا وہ خدا کا گھر نہیں بن سکتا۔

حاسد تجھ پر اگر حسد کرتا ہے ۔۔۔ کر صبر کہ خود وہ کارِ بد کرتا ہے
اپنی پستی کو کر رہا ہے محسوس ۔۔۔ اور تیری بلندیوں سے کد کرتا ہے

اکبرنے چھٹویں رباعی میں کہا ہے کہ بدخواہوں کی فطرت حسد کرنا ہے۔ حاسدوں کی بدخواہی سے پریشان ہونے کے بجائے صبر کرنا بہتر ہے کیوں کہ حاسد دوسروں کی ترقّی، عظمت اور برتری کو دیکھ کر خود کو پست اور کمتر سمجھنے لگتا ہے۔ دراصل یہی سبب ہے کہ وہ حسد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اکبرنے اس رباعی میں حسد کی بُرائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حسد نہ کرنے کی تلقین کی ہے۔

کچھ بھی نہیں چاہتے وہ چندے کے سوا ۔۔۔ اِس باغ میں کیا دَھرا ہے پھندے کے سوا
گل چیں ہے ہر اک، نہیں ہے بُلبُل کوئی ۔۔۔ اِس نکتے کو کون سمجھے بندے کے سوا

ساتویں رباعی میں اکبرنے سرسیّداحمد خاں کا نام لیے بغیر لوگوں کو اُن کے کارناموں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دراصل وہ شروع میں سرسیّداحمد خاں کے اصلاحی اور تعلیمی نظریات سے متفق نہیں تھے۔ اسی لئے وہ لوگوں کو آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرسیّداحمد خاں فریب کرکے بڑی ہوشیاری سے لوگوں کو اپنے دام میں پھانس کر چندہ وصول کرتے ہیں اور اُن کے تمام ساتھی بھی گل چیں یعنی پھولوں کو توڑنے والے ہیں۔ اُن میں سے کوئی بُلبُل یعنی پھول پر فدا ہونے والا نہیں ہے۔ سب اپنی ترقّی کے خواہاں ہیں، کسی کو مُلک وقوم کی فکر نہیں ہے۔ اس بات کو شاید میرے علاوہ اب تک کوئی سمجھا بھی نہیں ہے۔ اکبر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح مَیں سرسیّداحمد خاں کے کارناموں سے واقف ہوں اُسی طرح آپ لوگ بھی واقف ہوکر اُن کے ظاہری کارناموں سے متاثر نہ ہوں اور نہ اُن کے پھیر میں پڑیں۔

آگاہ ہوں معنیِ خوش اقبالی سے ۔۔۔ واقف ہوں بِنائے رتبۂ عالی سے
شرطیں عزت کی اور ہیں اکبر ۔۔۔ چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

اکبرنے آٹھویں رباعی میں سرسیّداحمد خاں اور مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں پر طنز کے تیر چلاتے ہوئے یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ اس دَور میں خوش اقبالی کس طرح میسر ہوتی ہے اور بلند مرتبہ کیسے حاصل کیا جاتا ہے؟ مَیں ان ہتھکنڈوں سے اچھّی طرح واقف ہوں۔ خوشامد اور نقّالی کے بغیر بھی عزّت وشرافت سے زندگی گزاری جاسکتی ہے مگر خوشامد کرنے والے شاید اس سے واقف نہیں۔ دراصل اکبر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ خوشامد، چاپلوسی اور نقّالی سے عارضی ترقّی تو حاصل ہوسکتی ہے مگر عزّت اور پائیدار سکون کا حصول ممکن نہیں۔

سیّد کی طرف تو چندہ لانے کی ہے پَخ ۔۔۔ اور شیخ کے گھر میں پنچ گانے کی ہے پَخ
بہتر تو یہی ہے کہ بُت پرستی کی جے ۔۔۔ گو اِس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے پَخ

اکبرؔ نے نویں رباعی میں حالاتِ حاضرہ کے کئی مسائل پر ایک ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دَور میں سیدھے سادے یا میرے جیسے لوگ کش مکش میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ وہ اس پس وپیش میں رہتے ہیں کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں؟ وہ کہتے ہیں کہ اگر سرسیّد احمد خاں کے مشن کی حمایت کی اور اُن کا ساتھ دیا تو وہ چندہ وصول کرنے کے کام میں لگا دیں گے۔ شیخ سے واسطہ رکھا تو وہ نماز پڑھنے، عبادت کرنے اور احکاماتِ الٰہی کا پابند رہنے کی تلقین کریں گے۔ پھر وہ کہتے ہیں کہ بُت پرستی کرنا سب سے آسان کام بھی ہے اور پُر لطف بھی مگر فوراً ہی اُن کا دھیان صبح کے وقت نہانے کی طرف جاتا ہے۔ واضح ہو کہ پوجا کرنے سے پہلے ہندو علی الصبح اسنان یعنی غسل ضرور کرتے ہیں اس لئے بُت پرستی کرنے کے لئے صبح کے وقت نہانا بھی باعثِ زحمت ہے۔

سیّد صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور   کہتا نہیں تم سے مَیں کہ ہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا اُنہوں نے لیکن   اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

دسویں رباعی اکبرؔ نے اُس وقت کہی تھی جب وہ سرسیّد احمد خاں کے نظریات سے بڑی حد تک متفق ہو گئے تھے اور وہ اُن کی حمایت بھی کھُل کر کرنے لگے تھے۔ اس رباعی میں اکبرؔ نے سرسیّد احمد خاں کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ سرسیّد احمد خاں نے قوم کی بھلائی اور اصلاح کے لئے بہت کام کیے ہیں۔ اُنہوں نے قوم کو جو شعور عطا کیا ہے مَیں اُن سے منحرف ہونے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ اُنہوں نے تو قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا ہے۔ جدید علوم وفنون سے بہرہ ور کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پابندی کرتے ہوئے اُن کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے ہی میں عافیت ہے۔

05.07 اکبر حُسین اکبرؔ الٰہ آبادی کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

کہتا ہوں مَیں ہندو و مسلماں سے یہی   اپنی اپنی رَوِش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ   موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

﴿۲﴾

گر جیب میں زَر نہیں تو راحت بھی نہیں   بازو میں سکت نہیں تو عزت بھی نہیں
گر علم نہیں تو زور و زَر ہے بے کار   مذہب جو نہیں تو آدمیت بھی نہیں

﴿۳﴾

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر   لکھیں یا رب ملک مِرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی کی ہے   پایا نہیں مَیں نے اُس کا انجام بخیر

﴿۴﴾

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے   رنگِ چمنِ فنا سے گھبراتا ہے
کہتی ہے نسیم آ کے رازِ فطرت   سُنتے ہی پیامِ دوست کِھل جاتا ہے

﴿۵﴾

اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں
اِس مُلک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ اِمرُ اُ القیس بنیں
پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

﴿۶﴾

علم وحکمت میں ہو اگر خواہشِ فیم
سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر اِیم
شادی نہ کر اپنی قبلِ تحصیلِ علوم
بُت ہو کہ پری ہو، خواہ وہ ہو کوئی میم

﴿۷﴾

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
اَفکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد
دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبٰی کا تصور اور اللہ کی یاد

﴿۸﴾

رُسوا وہ ہوا جو مستِ پیمانہ ہوا
لپکا جو سایہ پر وہ دیوانہ ہوا
انگلینڈ سے اپنا دل جو لایا نہ دُرُست
محروم اُدھر ، اِدھر سے بے گانہ ہوا

﴿۹﴾

بندوں نے بھلا دیا ہے وہ عہدِ الست
نا فہمی و حرص میں ہیں اکثر بدمست
کیا زید، بکر پہ معترض ہوتا ہے
اک گور پرست ہے تو اک زور پرست

﴿۱۰﴾

ہے ماہِ صیام کی نہایت تعریف
بے شبہہ یہ ہے مہذب و پاک ولطیف
نا اہلوں کو یہ کبھی لگاتا نہیں منہ
کہتے ہیں اِسی سبب سے رمضاں کو شریف

﴿۱۱﴾

شیطاں واعظ ہے، پنبہ درگوش رہو
غالب ہے اُسی کی بات، خاموش رہو
بدلا پاتا ہوں مجلسِ دَہر کا رنگ
مستی کی ہوس نہ ہو تو بے ہوش رہو

﴿۱۲﴾

پیتا ہوں شراب آبِ زم زم کے ساتھ
رکھتا ہوں اک اُونٹنی بھی ٹَم ٹَم کے ساتھ
ہے عشق حقیقی اور مجازی دونوں
قوال کی بھی صدا ہے، چَھم چَھم کے ساتھ

﴿۱۳﴾

دیکھے جو حوادثِ سماوی اَرضی
قائم کر لی ہیں تُو نے باتیں فرضی
بھولا ہے خدا کو تُو ذرا غور تو کر
زندہ رکھتی ہے تجھ کو خدا کی مرضی

﴿۱۴﴾

وہ غیرتیں، وہ صبر، وہ ایمان ہیں کہاں؟ حسنِ عمل کے دل میں وہ ارمان ہیں کہاں؟
اک غل مچا ہوا ہے کہ مسلم ہیں خستہ حال پوچھے ذرا کوئی کہ مسلمان ہیں کہاں؟

﴿۱۵﴾

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے، پتلون بھی ہے بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے
لیکن یہ مَیں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی! یورپ کا تِری رگوں میں کچھ خون بھی ہے؟

﴿۱۶﴾

حق نے جنہیں دی ہے فہمِ قرآنِ مجید ہونے کے نہیں وہ پیرِ گردوں کے مُرید
بدلے سَو رنگ انقلابِ دنیا ہر حال میں اُن کو ہے خدا ہی سے اُمید

﴿۱۷﴾

ہر ایک کو خوش کروں مَیں کیوں کر صاحب؟ اپنی ہی طرف بُلاتے ہیں ہر صاحب
آسائشِ عُمر کے لئے کافی ہے بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

﴿۱۸﴾

ماشاء اللہ وہ ڈِنر کھاتے ہیں بنگالی بھائی اُن کا سَر کھاتے ہیں
بس ہم ہیں خدا کے نیک بندے اکؔبر اُن کی گاتے ہیں، اپنے گھر کھاتے ہیں

﴿۱۹﴾

یورپ والے جو چاہیں دل میں بَھر دیں جس کے سَر پر جو چاہیں تہمت دَھر دیں
بچتے رہو اُن کی تیزیوں سے اکؔبر تم کیا ہو؟ خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

﴿۲۰﴾

اکؔبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بےخوف لا حول کا ترجمہ کر اَنگریزی میں

05.08 خلاصہ

اکؔبرالہ آبادی کی زندگی کی طرح اُن کی شاعری میں بھی کئی اہم موڑ آئے۔ وہ ابتدا میں سرکاری ملازمتوں کے لئے پریشان رہے لیکن بعد میں کئی اہم عہدوں پر بھی فائز ہوئے۔ اُنہیں انگریزی حکومت نے ''خان بہادر'' کے خطاب سے بھی نوازا تھا۔ اکؔبر کو بچپن ہی سے شاعری کا شوق تھا اور وہ چوری چھپے اشعار کہہ کر اپنے ذوق کی تسکین کر لیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کچھ عرصہ کے بعد وحیؔد الہ آبادی کی شاگردی اختیار کر لی اور با قاعدہ شعر کہنے لگے۔ اکؔبر نے ایک عرصہ تک جلیل مانک پوری سے بھی اصلاح لی۔

اکبرؔ نے شروع میں دبستانِ لکھنؤ کی شاعری سے متاثر ہوکر روایتی انداز میں غزلیں کہی ہیں۔اس دَور کی بیش تر غزلوں میں داخلیت سے زیادہ خارجیت پر زور دیا گیا ہے۔وارداتِ عشق کا بیان سطحی اور عمومی ہے۔یہی نہیں بلکہ اُن کے بعض اشعار میں تو عشقیہ جذبات کا اظہار رکاکت اور ابتذال کی حد تک نظر آتا ہے۔

اُن کی شاعری میں اُس وقت اہم موڑ آیا جب وہ اپنے دَور کے مسائل سے متاثر ہوکر قدیم طرز وفکر اور فرسودہ مضامین کے بجائے شوخی،ظرافت اور طنز کی طرف متوجّہ ہوئے۔دراصل اُن کے دَور میں ہندوستانی معاشرہ بڑی تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔لوگ بڑی حد تک اپنے اجداد کے تاب ناک کارناموں کو فراموش کر چکے تھے اور مشرقی تہذیب کو چھوڑ کر مغربی تہذیب کو فیشن کے طور پر اپنا رہے تھے۔لوگ احساسِ کمتری میں مبتلا تھے۔اکبرؔ نے قوم کی بدحالی پر آنسو بہانے کے بجائے طنز وظرافت کے پیرایے میں اپنے کلام کے ذریعہ قوم کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کا بے مثل کارنامہ انجام دیا۔وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی عوام اور بالخصوص مسلمان مغربی تہذیب کی چکاچوندھ میں پڑ کر راہِ راست سے بھٹک گئے ہیں۔اسی لئے اُنھوں نے شعوری طور پر معاشرے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور ہر چھوٹے بڑے واقعات و مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بنا کر اس طرح پیش کیا کہ لوگ نہ صرف غور وفکر کرنے کے لئے مجبور ہو گئے بلکہ متاثر بھی ہوئے۔

اکبرؔ نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔رباعی گو کی حیثیت سے بھی اُن کا شمار ممتاز شعرا میں کیا جاتا ہے۔اُنھوں نے رباعی کے روایتی مضامین جیسے تصوّف، مذہب، بے ثباتیِ دنیا،اخلاق اور مناظرِ فطرت کے علاوہ حالاتِ حاضرہ کے مسائل کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔اُنھوں نے اپنی رباعیات کے ذریعہ بھی قوم کو پستی اور بدحالی سے نجات دلانے،احساسِ کمتری سے بچانے،اعلیٰ کردار اور بلند اخلاق پیدا کرنے اور جمود وقنوطیت کے حصار سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔اُن کی رباعیوں میں طنز وظرافت بھی ہے،شوخی بھی ہے اور سنجیدگی بھی۔غزلیں ہوں یا نظمیں،قطعات ہوں یا رباعیات اُن کا مقصد ہر صنفِ سخن کے ذریعہ قوم کے ہر فرد تک اپنے پیغام کو پہنچانا اور اُن کی اصلاح کرنا تھا۔اکبرؔ نے سرسیّد احمد خاں کی مخالفت اور حمایت میں بھی کئی رباعیاں کہی ہیں۔اُن کا بیش تر کلام بشمول رباعیات آسان اور عام فہم ہے۔اُن کے کلام کی نمایاں خوبی صداقت اور صاف گوئی ہے۔

05.09 فرہنگ

آسمانی باپ : اللہ تعالیٰ،خدا
آگاہ ہونا : واقف ہونا،باخبر ہونا
اپنے آپ کو : خود کو
اُٹھنا : ایستادہ ہونا،بیدار ہونا،جاگنا
اُڑ جانا : غائب ہو جانا،نابود ہو جانا
اک دن : ایک روز،کسی دن
اللہ کا نام لینا : خدا کو یاد کرنا
امر : بات،معاملہ

دَنی : کمینی،رذیل،کم ظرف
دنیائے دَنی : کمینی دنیا،رذیل دنیا
دیکھنا : ہوشیار رہنا،باخبر رہنا
ڈوبنا : غرق ہونا،ملوّث ہونا
رخصت کرنا : روانہ کرنا،بھیجنا،وداع کرنا
رونق : زینت،زیبائش
سکھانا : تعلیم دینا،تربیت دینا،بتانا
سِوا : علاوہ،بغیر،بجز

اور : دیگر، دوسری، بہت سی، مزید

باغ : گلشن، گلزار، چمن (مزاجاً: دنیا، عالم)

بُت پرستی : مورتی پوجا، دیوی/دیوتاؤں کے مجسّموں کی پوجا

بچائے رکھنا : محفوظ رکھنا، حفاظت کرنا

برق گرنا : آسمانی بجلی کے شعلہ کا کسی کو جلا دینا

بَس : صرف، فقط

بَس جانے دو : آباد ہو جانے دو، ٹھہر جانے دو، قیام کرنے دو

بلندی : عروج، ترقّی

بِنا : اصلیت، حقیقت

بندہ : انسان، بشر (یہاں بمعنی خود شاعر کے ہیں)

بے شمار : شمار سے باہر، جنکی گنتی نہ کی جا سکے، بے حساب

بِینا : روشن، جو دیکھ سکیں

بھاپ : بخار، بخارات

بھولنا : فراموش کرنا، خیال نہ رکھنا

پایا : محسوس کیا

پَخ : شرط، بے کار کی علّت

پستی : زوال، رذالت، کمینگی، تنزّلی

پنج گانہ : پانچوں وقت کی نمازیں

پیری : بڑھاپا، ضعیفی

پیری آنا : بڑھاپا آنا، بوڑھا ہو جانا، ضعیف

پھندا : رسّی، دھاگے یا تار کا وہ حلقہ یا پھلّا جس سے پرندوں کو پھنسایا جاتا ہے، فریب

جانے دو : دور کرو، چھوڑ دو، درگزر کرو

جگانا : نیند سے اُٹھانا، بیدار کرنا، ہوشیار کرنا

سوتوں : سوئے ہوئے، خوابیدہ لوگ، غفلت زدہ، غافل

سیّد : سر سیّد احمد خاں

شرطیں : شرط کی جمع، وہ چیزیں جن پر کسی بات کا انحصار ہو

شعور : سلیقہ، تمیز

شیخ : مذہبی علوم میں فائق، مذہبی پیشوا

صاف : بے لاگ، دُرست، ٹھیک

صبر کرنا : تحمّل کرنا، توکّل کرنا، برداشت کرنا

طریق : طریقہ، روش، ڈھنگ

غفلت : بے خبری، غلطی، خطا، قصور، کوتاہی

غفلت میں ڈوبا ہونا : غافل ہونا، بے خبر ہونا، قصور کرنا، خطا کرنا

فیشن : طور طریقہ، آرائش و زیبائش (Fashion)

کارِ بد : بُرا کام، فعلِ بد

کارِ بد کرنا : بُرا کام کرنا، فعلِ بد کرنا

کام نہ چلنا : بات نہ بننا، مقصد حاصل نہ ہونا

کُد کرنا : پریشان ہونا، تکلیف میں مبتلا ہونا

گلچیں : باغبان، مالی، گلشن کی حفاظت کرنے والا

گلچیں : پھول توڑنے والا، پھول چُننے والا

کیا دھرا ہے : کچھ بھی نہیں ہے

لطفِ زندگانی : زندگی کا مزہ، لذّتِ زندگانی

محسوس کرنا : احساس کرنا، سمجھنا

معاف کرنا : درگزر کرنا، عفو کرنا، بخشنا

نفور ہونا : نفرت کرنا، کنارہ کشی کرنا، بے زار ہونا، تسلیم نہ کرنا

جہانِ فانی	:	دنیائے بے ثبات، عالمِ ناپائیدار	نقّالی	:	نقل کرنا، کسی کے کام کو دیکھ کر اُسی طرح کا کام کرنے کی کوشش کرنا
چندہ	:	وہ رقم جو کسی کام کے لئے مختلف لوگوں سے لے کر جمع کی جائے	نکتہ	:	باریکی، تہ کی بات، باریک بات
حاسد	:	حسد کرنے والا، بدخواہ	نہانا	:	غسل کرنا، اسنان کرنا، وہ غسل جو پوجا یا پرستش کرنے سے پہلے ہندو کیا کرتے ہیں
حسد کرنا	:	کسی کا زوال چاہنا، بغض رکھنا، کسی سے جلنا			
خاروخس	:	کانٹے اور گھاس، گھاس پھوس	واقف ہونا	:	آگاہ ہونا، باخبر ہونا
خلاف	:	ناموافق، اُلٹا	ہَوس	:	لالچ، بے جا خواہش
خوش اقبالی	:	اقبال مندی، خوش نصیبی	یورُپ	:	دنیا کے سات روایتی برّ اعظموں میں سے ایک برّ اعظم کا نام
دل میں بسانا	:	دل میں جگہ دینا، قلب میں رکھنا			

05.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ اکبرالٰہ آبادی کی زندگی کے کسی ایک اہم واقعہ پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲ اکبرالٰہ آبادی کی نظم گوئی کی کسی ایک اہم خصوصیت کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳ اکبرالٰہ آبادی کی رباعیات کے کسی خاص موضوع پر اظہارِ خیال کیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ رباعیات کے خاص موضوعات پر ایک مضمون قلم بند کیجیے۔

سوال نمبر۲ اکبرالٰہ آبادی کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کے عنوان سے ایک مضمون تحریر کیجیے۔

سوال نمبر۳ کیا اکبرالٰہ آبادی کی رباعیاں طنز وظرافت کی آئینہ دار ہیں، اظہار خیال کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : اکبرالٰہ آبادی کی پیدائش ضلع الٰہ آباد کے کس مقام میں ہوئی تھی؟

(الف) بارہ (ب) ہنڈیا (ج) پھول پور (د) سوراؤں

سوال نمبر۲ : اکبرالٰہ آبادی کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت کیا ہے؟

(الف) سنجیدگی (ب) طنزوظرافت (ج) رکاکت وابتذال (د) قدیم طرز وفکر

سوال نمبر۳ : اکبرالٰہ آبادی کی پہلی بیوی کا نام کیا ہے؟

(الف) فاطمہ صغریٰ (ب) بوٹا جان (ج) نواب جان (د) خدیجہ بی بی

سوال نمبر۴ : رباعی کا کون سا مصرع سب سے زیادہ جان دار ہوتا ہے؟

(الف) پہلا (ب) دوسرا (ج) تیسرا (د) چوتھا

سوال نمبر۵ : انگریزی سرکار نے اکبرالٰہ آبادی کو کس خطاب سے نوازا تھا؟

(الف) سر (ب) خان بہادر (ج) رائے بہادر (د) قیصرِ ہند

سوال نمبر۶ : ''حیاتِ اکبرالٰہ آبادی'' کے مصنف کا نام کیا ہے؟

(الف) محمد ہاشم (ب) شیخ الٰہی بخش گنائی (ج) طالب الٰہ آبادی (د) عشرت حسین

سوال نمبر۷ : اکبرالٰہ آبادی کی شاعری کی وجہ سے اُنہیں کس خطاب سے یاد کیا جاتا ہے؟

(الف) لسان العصر (ب) فصاحتِ جنگ (ج) طوطیٔ ہند (د) ملک الشعرا

سوال نمبر۸ : ایک رباعی میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

(الف) ایک (ب) دو (ج) تین (د) چار

سوال نمبر۹ : اکبرالٰہ آبادی کی وفات کب ہوئی تھی؟

(الف) ۱۸۷۶ء (ب) ۱۹۱۹ء (ج) ۱۹۲۱ء (د) ۱۸۵۹ء

سوال نمبر۱۰ : مندرجہ ذیل شعر میں اکبرالٰہ آبادی نے گاندھی جی کو کیا کہا ہے؟

بدھّو میاں بھی حضرتِ گاندھی کے ساتھ ہیں ☆ گومشتِ خاک ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

(الف) بدّھو (ب) مُشتِ خاک (ج) آندھی (د) میاں

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) بارہ

جواب نمبر۲ : (ب) طنز وظرافت

جواب نمبر۳ : (د) خدیجہ بی بی

جواب نمبر۴ : (د) چوتھا

جواب نمبر۵ : (ب) خان بہادر

جواب نمبر۶ : (د) عشرت حسین

جواب نمبر۷ : (الف) لسان العصر

جواب نمبر۸ : (د) چار

جواب نمبر۹ : (ج) ۱۹۲۱ء

جواب نمبر۱۰ : (ج) آندھی

05.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ اکبر کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ از ڈاکٹر صغرا مہدی

۲۔ رباعیاتِ اکبرالٰہ آبادی از شیخ الٰہی بخش گنائی

۳۔ کُلیاتِ اکبرالٰہ آبادی (حصّہ اوّل) از اکبرالٰہ آبادی

۴۔ اکبر کی طنزیہ اور ظریفانہ شاعری از محمّد زاہد
۵۔ حیاتِ اکبر الٰہ آبادی از سیّد عشرت حُسین

بلاک نمبر 02

اکائی	06	سیداحمد حسین امجد حیدرآبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر ثوبان سعید
اکائی	07	جگت موہن لال رواں (بحیثیتِ رباعی گو)	محمد افضل حُسین
اکائی	08	رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری (بحیثیت رباعی گو)	محمد افضل حُسین
اکائی	09	شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)	ڈاکٹر ثوبان سعید

اکائی 06 سید احمد حسین امجؔد حیدرآبادی (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

06.01 : اغراض ومقاصد

06.02 : تمہید

06.03 : سید احمد حسین امجؔد حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی

06.04 : سید احمد حسین امجؔد حیدرآبادی بحیثیتِ رباعی گو

06.05 : رباعیاتِ امجؔد "اقتباس"

06.06 : رباعیاتِ امجؔد "تشریح"

06.07 : سید احمد حسین امجؔد حیدرآبادی کی منتخب دیگر رباعیاں

06.08 : خلاصہ

06.09 : فرہنگ

06.10 : سوالات

06.11 : حوالہ جاتی کتب

06.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں آپ امجؔد حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی پڑھیں گے۔اور اردوادب کے میدان میں رباعی کے تعلق سے خاص طور پر ان کی خدمات کے بارے میں گفتگو کی جائے گی۔اوراس کے ساتھ ہی ان کی دس رباعیوں کی آسان انداز میں تشریح پیش کی جائے گی اور آخر میں اکائی کا خلاصہ بھی پیش کیا جائے گا۔ساتھ ہی الفاظ ومعانی اورنمونہ کے لئے مختصراور تفصیلی سوالات اوراپنے مطالعے کی جانچ کے جوابات بھی دیئے جائیں گے ہیں جب کہ بالکل آخر میں حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی دی جائے گی۔

06.02 تمہید

دکن کو یہ شرف حاصل ہے کہ سرزمینِ دکن میں علم وادب کی بہت سی نام وَر شخصیتوں نے جنم لیا ہے اورانھوں نے اپنے اپنے میدان میں ایک ممتاز مقام حاصل کیا ہے اور کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں۔ یہ اعجاز بھی اسی سرزمین کو حاصل ہے کہ اردوادب کا پہلا صاحب دیوان شاعر اسی مٹی کا پروردہ ہے جس کا اسم گرامی محمد قلی قطب شاہ ہے۔اسی کے ساتھ یہ بھی واضح کرتے چلیں کہ وجہؔی اور نصرتؔی جیسے عظیم شاعر بھی یہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے۔ولؔی جیسا شاعر بھی جس کواردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے وہ بھی دکن سے ہی تعلق رکھتا ہے کہ جس نے شمالی

ہند کے شعرا کو اردو زبان کے حسن ولطف اور وسعت وکشادگی سے واقف کرایا۔اور پھر اپنے کلام کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ اس نومولود زبان میں بھی تخلیق اظہار کی بے پناہ صلاحتیں موجود ہیں۔ولی کے توسط سے جو زبان دہلی میں کمتر وکمزور سمجھی جاتی تھی اب شعروشاعری کے استعمال ہونے لگی تھی۔اسی سرزمینِ دکن میں امجؔد حیدرآبادی نے بھی اپنی آنکھیں کھولیں۔

06.03 سید احمد حسین امجد امجؔد حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی

آپ کا پورا نام سید احمد حسین تھا۔آپ کے والدمحترم صوفی رحیم علی بن سید کریم ایک متقی و پرہیز گار شخصیت تھے۔آپ کے یہاں بیس بچوں کی پیدائش ہوئی تھی لیکن ان میں سے کوئی زندہ نہیں رہا۔آپ اپنے والدین کی اکیسویں اولاد تھے۔۶/رجب ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء بروز دوشنبہ(پیر)کو آپ حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔جب امجد کی عمر ۴۰/دن کی ہوئی تو آپ کے والدمحترم اس دارفانی سے کوچ کر گئے تب امجؔد کی پرورش و پرداخت آپ کی والدہ ماجدہ صوفیہ بیگم نے کی۔آپ کی والدہ محترمہ بھی ایک نیک، مذہبی، پرہیزگار، تقوی شعار خاتون تھیں اور اپنے بچوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کے لئے حوصلہ افزائی کرتی رہتی تھیں۔امجد کی ابتدائی تعلیم عام رواج کے مطابق گھر پر ہوئی۔امجؔد کی پرورش وتربیت میں والدہ محترمہ کا بہت بڑا ہاتھ تھا اسی لئے ہمیشہ ان میں کچھ کرگزرنے آرزوؤں کے رگ وپے میں خون کی طرح سرایت کیے ہوئے تھی۔پھر آپ نے حیدرآباد کی مشہور درس گاہ جامعہ نظامیہ میں چھ سال تک تعلیم پائی۔جامعہ نظامیہ میں تعلیم کے دوران کی مزید ذہنی تربیت کو فروغ ہوا۔اس کے بعد آپ نے پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا۔اس کے بعد استادِ فلسفہ مولانا سیّد نادرالدین مرحوم سے مزید تعلیم حاصل کی جو کہ حضرت علاّمہ فضل حق خیرآبادی کے شاگرد رشید تھے۔ایک بار آپ کی والدہ نے آپ سے کہا کہ:

''اگر دنیا میں جینا ہے تو کچھ ہو کر جیو ورنہ مرجاؤ۔''

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک امیر آدمی پالکی میں سوار امجؔد کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا۔کہاروں کے ساتھ ایک کارندہ بھی پالکی تھامے دوڑ رہا تھا۔امجد کی والدہ نے امجد کو یہ منظر دکھا کر پوچھا! کہ تم کیا بننا پسند کروگے؟امجد نے جواب دیا''پالکی سوار''۔والدہ نے کہا ایسی زندگی اسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب تم علم حاصل کرو، ورنہ تمھیں بھی پالکی کے ساتھ دوڑنا ہوگا''۔والدہ محترمہ کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ امجد نے علم حاصل کرنے کے لئے جی جان سے محنت کی۔چودہ یا پندرہ برس کی عمر سے امجد نے اپنی شاعری کی ابتدا کی۔اٹھارہ سال کی عمر میں آپ کی شادی شیخ میراں کی لڑکی محبوب النساء بیگم سے ہوئی۔جن کے بطن سے ایک لڑکی اعظم النساء کی پیدائش ہوئی۔یہی وجہ ہے کہ امجد ابوالاعظم کہلائے جانے لگے۔امجد چاہتے تو نہایت عیش وعشرت کی زندگی بسر کرسکتے تھے مگر صوفیانہ مزاج کے حامل امجد نے دنیاوی عیش وعشرت سے ہمیشہ دوری بنائے رکھی۔متانت وسنجیدگی ان کی طبیعت کا خاصہ تھے۔آپ صوفیانہ مزاج کے حامل شخص تھے۔صبر وقناعت آپ کے اندر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔آپ نے اپنی زندگی بے حد سادگی سے گزاری۔سادگی اتنی کہ لباس اور غذا میں بھی اعتدال اور سادگی اختیار کی۔رہن و سہن اور عادت واطوار میں کبھی بھی تصنع سے کام نہ لیا۔آپ بے حد خوددار تھے لیکن مزاج میں انکسار ان کا خاص طرّہ امتیاز تھا۔شان وشوکت اور خودنمائی سے پرہیز کیا ہمیشہ عبادت وریاضت میں اپنی زندگی بسر کی۔آپ نے کسی احسان لینا بھی گوارا نہ کیا بلکہ جہاں تک ممکن ہوسکا دوسروں لوگوں کی امداد کی۔شادی کے دوسال کے بعد امجد بنگلور چلے گئے اور وہاں تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہوگئے۔لیکن واپس جلد ہی حیدرآباد آگئے۔حیدرآباد آنے کے بعد مدرسہ دارالعلوم میں استاد مقرر ہوگئے۔مدرسہ دارالعلوم میں چند برس تدریسی خدمت انجام دینے کے

بعد وہ صدر محاسبی (اکاؤنٹینٹ جنرل) کے دفتر میں ملازم ہوگئے اور ترقی کرتے ہوئے مددگار صدر محاسب (ڈپٹی اکاؤنٹینٹ جنرل) کے عہدہ پر پہنچ کر ۵۵ ر برس کی عمر میں وظیفہ پر سبک دوش ہوئے۔

۱۹۰۸ء میں ایک بہت خوفناک حادثہ رونما ہوا۔ جس نے ان کی زندگی کو رنج والم سے بھر دیا۔ حیدرآباد کی موسیٰ ندی میں خوفناک طوفان آیا اور یہ طوفان اتنا تباہ کن تھا کہ شہر کا ایک بڑا حصہ اس موسیٰ ندی کے سیلاب کی نذر ہوگیا۔ امجد بھی ندی کے قرب وجوار میں رہتے تھے۔ ان کا مکان بھی اس سیلاب کی زد میں آ گیا اس میں نہ صرف آپ کا مال واسباب دریا برد ہوا بلکہ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کی والدہ ماجدہ، بیوی اور ۴ رسالہ بچی اعظم النساء بھی اس سیلاب کی نذر ہوگئیں اور آپ انہیں نہ بچا سکے۔ اس حادثہ نے آپ کے ذہن و دماغ پر بہت ہی برا اثر ڈالا۔ کئی سال تک وہ تنہائی کی زندگی بسر کرتے رہے۔ سیلاب کی تباہ کاریوں اور اپنے شاداب خاندان کی بربادی کا دردناک حال انہوں نے ''جمال امجد'' نام سے اپنی خودنوشت سوانح میں لکھا ہے۔ مذکورہ پس منظر پیش کرتی دو رباعی ملاحظہ کیجیے:

سیلاب میں جسمِ زار گویا خس تھا غرقابِ محیطِ غمِ کس و ناکس تھا
اتنے دریا میں بھی نہ ڈوبا امجدؔ غیرت والے کو ایک چُلّو بس تھا

☆

کس وقت دلِ غمزدہ مغموم نہیں رونے دھونے کی کس گھڑی دُھوم نہیں
قبرِ مادر تو خیر بن ہی نہ سکی لیکن گورِ پدر بھی معلوم نہیں

امجدؔ نے علامہ سید نادرالدین سے فلسفہ ومنطق پڑھی تھی اور علامہ امجدؔ کو بہت چاہتے تھے۔ امجدؔ کے ذہنی کرب کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اپنی بیٹی جمال سلمیٰ امجد کے نکاح میں دیدی۔ جس کے بعد امجد کی زندگی میں ایک ٹھراؤ سا آ گیا۔ ۱۹۲۸ء میں امجد اپنی اہلیہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے تشریف لے گئے۔ ''حج امجدؔ'' کے نام سے ایک انہوں نے ایک سفرنامہ بھی لکھا۔ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے انہوں نے ایک رباعی کہی۔ جو کہ آپ کی نذر کی جاتی ہے:

رستہ تیرا اِس طرح سے طے کیا ہے ہم نے سب تیری رہ میں دے دیا ہے ہم نے
مل لیں گے کبھی تجھ سے بھی اِن شاء اللہ گھر تیرا دیکھ ہی لیا ہے ہم نے

حج بیت اللہ سے واپسی کے ایک سال بعد ان کی بیوی جمال سلمیٰ کا انتقال ہوگیا۔ ۱۹۳۰ء میں امجدؔ نے تیسری شادی سید ابراہیم حسینی کی دختر قمرالنساء بیگم سے کی جو امجدؔ کی وفات کے بعد بھی زندہ رہیں۔ مختصر سی بیماری کے بعد امجدؔ ۲۹ ر مارچ ۱۹۶۱ء کو اس دارفانی کو الوداع کہتے ہوئے اپنے معبودِ حقیقی سے جا ملے۔ درگاہ شاہ خاموش کے احاطے میں دوسری اہلیہ جمال سلمیٰ کے پہلو میں امجد کی تدفین ہوئی۔

06.04 سید احمد حسین امجد امجدؔ حیدرآبادی بحیثیتِ رباعی گو

امجدؔ حیدرآبادی کی شاعری کا آغاز چودہ یا پندرہ برس کی عمر میں غزل گوئی سے ہوا۔ ابتداً حبیب کنتوری اور ترکی کو اپنا کلام دکھایا۔ مگر آپنے اس کے بعد کسی سے اصلاح نہ لی۔ چوں کہ آپ فطرتاً شاعر تھے۔ اس لئے کسی استاد کی ضرورت بھی نہ تھی۔ حیدرآباد میں اس زمانے میں فصیح الملک داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا شاعر داغ کے رنگ وآہنگ میں شعر کہنے پر بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ اسی رنگ میں امجدؔ بھی شاعری کرنے لگے۔ امجدؔ کی ابتدائی شاعری پر داغ کا صاف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مگر وہ دھیرے دھیرے وہ داغؔ کے سحر سے باہر آئے اور

نقطۂ نظر نظم گوئی کی طرف مرکوز کر دیا۔امجد کی پہلی نظم ''دنیا اور انسان'' ہے جوکہ آپ نے تقریباً بیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔امجد کی کئی نظمیں 'مخزن اور زمانہ' جیسے اہم رسالوں کی زینت بنیں اور عوام میں پسند کی گئیں۔آپ کی نظموں کے دو مجموعے ''ریاضِ امجد حصہ اول، دوم'' کی اشاعت ہوئی۔ان مجموعوں کے علاوہ نثر میں بھی امجد کی آٹھ کتابیں شائع ہوئیں۔

امجؔد حیدرآبادی البتہ اردو رباعی کے پہلے شاعر ہیں۔جنہوں نے اس صنف سخن کی طرف خصوصی توجہ کی ہے۔امجؔد کی اہمیت خاص طور پر ان کی رباعی گوئی کی وجہ سے ہے۔امجد کی کہی ہوئی رباعیاں آج بھی عوام وخواص کی زبان سے سنی جاتی ہیں۔امجد کی رباعی کے تین مجموعے شائع ہوئے۔''رباعیات امجد حصۂ اول ۱۹۲۵ء میں، رباعیات امجد حصۂ دوم ۱۹۳۵ء میں، جب کہ رباعیات امجد حصۂ سوم ۱۹۵۵ء'' میں شائع ہوا۔آپ کی رباعیوں میں صوفیانہ رنگ غالب ہے۔آپ نے رباعیوں میں زندگی کے اخلاقی پہلوؤں کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔امجؔد نے اپنی رباعیوں میں معنویت اور اظہار کی قوت سے ایک ایسی کیفیت پیدا کر دی کہ امجؔد کا نام اردو رباعی کے ساتھ جڑ گیا۔امجؔد نے انسانی زندگی کے اہم گوشوں کو نہایت سادگی اور چابک دستی ایسے پیش کیا کہ بات سننے والے کے دل میں اُتر جائے۔آپ عجز وانکسار کا نمونہ تھے۔امجؔد کی رباعیوں کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے۔کہ امجؔد کو رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے۔جوفنی پختگی ان کے یہاں ملتی ہے وہ کسی اور کے یہاں نظر نہیں آتی۔امجؔد حیدرآبادی کی رباعیاں سارے ہندوستان میں مشہور تھیں آپ کو رباعی کا بے تاج بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا لیکن وہ کس قدر عجز وانکسار سے کہتے ہیں۔

ہم توڑ کے تارے آسماں سے لائے　　مضمونِ بلند لا مکاں سے لائے
ہر شعر بہ اعتبارِ فن خوب کہا　　لیکن کوئی تاثیر کہاں سے لائے؟

اکثر دیکھا گیا ہے کہ شعرا حضرات رباعی کے اوزان سے لوگ گھبراتے ہیں ہیں۔رباعی کے وزن میں غالب جیسا شخص بھی دھوکہ کھا جاتا ہے۔لیکن امجد ہیں کہ نظمیں بھی رباعی کے وزن میں کہتے ہیں۔ان کے مجموعۂ کلام میں کئی نظمیں رباعی کی بحروں میں ملتی ہیں۔امجد صوفی منش، قانع، متوکل، خدا ترس آدمی ہیں۔ان کے موضوعات اگر چہ تصوف، توحید، عشق حقیقی اور عرفان سرمدی تک محدود ہیں۔پھر بھی پھیکا پن کہیں نہیں بلکہ ایک ایسی رندانہ سرمستی اور عارفانہ سرمستی رچی ہوئی ہے جوکہ معمولی سی بات میں بھی غزل کا سا کیف واثر بھر دیتی ہے۔

مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی ان کو زندہ سرمد کہا کرتے تھے:

انسان سمجھتا ہے کہ مَیں بھی کچھ ہوں　　نادان سمجھتا ہے کہ مَیں بھی کچھ ہوں
لا حول وَلا قوۃ اِلا باللہ　　شیطان سمجھتا ہے کہ مَیں بھی کچھ ہوں

امجؔد حیدرآبادی نے اپنی رباعیوں کے ذریعہ اخلاقیات کا درس دیا ساتھ ہی ساتھ انسانی اقداروں کو بھی پیش کیا کیوں کہ آپ خود بھی صوفی مزاج رکھتے تھے اسی وجہ سے ان کی رباعیوں میں صوفیانہ رنگ صاف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے آپ کو پہلا اور آخری رباعی گو شاعر لکھا ہے۔انہوں نے اس کی توجیہ یہ بیان کی ہے کہ یوں تو اردو کے بہت سے شعرا نے رباعی کی صنف میں طبع آزمائی کی مگر کوئی بھی امجؔد حیدرآبادی کی بلندیوں نہ چھو سکا۔آپ کو رباعی کے فن پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔عام طور پر شعرا اس کے وزن کی پیچیدگی کی بناء پر اس سے دوری بنائے رکھتے ہیں۔قدرت نے امجؔد کا مزاج رباعی کے وزن اس طرح ہم آہنگ کر دیا تھا کہ آپ نے تو سیکڑوں

رباعیاں کہہ ڈالیں۔امجدؔ کے یہاں اخلاق وتصوف،روحانیت اور پندونصائح پرمبنی مضامین نظرآتے ہیں۔آپ ایک وسیع المشرب اور درد مند شاعر تھے۔آپ انسانوں کے دکھ درد کو سمجھتے تھے۔مجبوری وبیکسی اورافلاس سے آپ خود بھی گزر چکے تھے۔انہیں وجوہات کی بدولت آپ کی شاعری میں یہ تمام عناصر اپنے عروج پر نظر آتے ہیں۔کسی کو ستانا اور کسی کا دل توڑنا آپ کے نزدیک ایک گناہِ کبیرہ تھا۔

آپ کی ایک رباعی میں یہی پیغام دیا گیا ہے۔ذیل میں وہ پیامی رباعی ملاحظہ کیجیے:

مغموم کے قلبِ مضمحل کو توڑا یا منزلِ فیضِ متصل کو توڑا
کعبہ ڈھاتا تو پھر بنا بھی لیتے رونا تو یہ ہے کہ تُو نے دل کو توڑا

آپ کبھی نام ونمود کے قائل نہیں رہے۔انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کو جاہ وحشمت،دولت وعزت نصیب ہو اور وہ اسے حاصل کرنے کے لئے لاکھوں کوششیں کرتا ہے۔مگر امجد ہمیشہ ہی سے ان چیزوں سے بے زار و بے نیاز رہے۔وہ دائمی خوشی کو ہی اہم مانتے ہیں۔ انہوں نے اسی بات کو ذیل کی رباعی میں اس طرح پیش کیا ہے:

کیا فکر ہے، کوئی قدرداں ہو کہ نہ ہو جھوٹی دنیا میں عزو شاں ہو کہ نہ ہو
اللہ مسرتِ حقیقی دے دے ہم زندہ رہیں، نام ونشاں ہو کہ نہ ہو

امجد کی شاعری کا ایک اہم اور نمایاں وصف تصوف ہے۔اور تصوف کا پہلوان کی رباعیوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔وحدت الوجود کا مسئلہ تصوف میں کافی پیچیدہ اور اُلجھا ہوا ہے۔صوفیائے کرام کی اکثریت نے اس کو الگ الگ طریقے سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ امجدؔ نے بھی اس مسئلے کو اپنی ایک رباعی میں نہایت سہل طریقے سے سمجھایا ہے۔اس رباعی کو بھی ملاحظہ کیجیے:

ہیں مستِ مئے شہود تُو بھی مَیں بھی ہیں مدّعیِ نمود تُو بھی مَیں بھی
یا تُو ہی نہیں جہاں میں، یا مَیں ہی نہیں ممکن نہیں دو وجود تُو بھی مَیں بھی

میدانِ تصوف میں وحدت الوجود کے فلسفے کے بارے میں امجد کی چند رباعیاں ذیل میں آپ کے لئے پیش کی جاتی ہے۔

ذرّے ذرّے میں ہے خدائی، دیکھو ہر بت میں ہے شانِ کبریائی، دیکھو
اعداد تمام مختلف ہیں باہم ہر ایک میں ہے مگر اکائی، دیکھو

☆

واجب سے ظہورِ شکلِ امکانی ہے وحدت میں دُوئی کا وہم نادانی ہے
دھوکہ ہے نظر کا، ورنہ عالم ہمہ اُوست گرداب، حباب، موج، سب پانی ہے

☆

اِنسان ہزار ہیں مگر قسم ہے ایک گو حرف کثیر ہیں مگر اِسم ہے ایک
اِس عالَمِ کثرت کا ہے منشا واحد اَعضا ہیں جدا جدا مگر جسم ہے ایک

امجؔد کی یہ کوشش تھی کہ اپنی رباعیوں میں ایسا پیغام پیش کریں جس سے قارئین کو اخلاق وسیرت کی تعلیم ملے اور اس تعلیم سے وہ اپنی کردار سازی کر سکیں۔ کیوں کہ شعرا کا عام رویہ یہ رہا ہے کہ انعامات واکرامات حاصل کرنے کی غرض سے امیروں اور بادشاہوں کی شان میں قصیدے لکھتے تھے۔ امجؔد کا ایمان وایقان تھا کہ عطا کرنے والا اللہ رب العزت ہے اسی لئے غیروں کے آگے ہاتھ پھیلانا مناسب نہیں۔ ذیل کی رباعی میں امجد نہایت سادگی سے تلقین کرتے ہیں کہ کس سے مانگنا چاہیے اور کس طرح مانگنا چاہیے:

ہر چیز مسبّبِ سبب سے مانگو　　منّت سے، خوشامد سے، ادب سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہو　　بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

دورِ حاضر امتِ مسلمہ کے لئے بے حد دشوار ہے۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کو ذلیل ورسوا کیا جا رہا ہے۔ ان کی کلاہ اور دستاریں کھینچی جا رہی ہیں۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ ہے کہ امتِ مسلمہ نے سچائی، نیکی اور ایمان داری کا راستہ اپنانے کے بجائے غلط راستے اختیار کر لیے ہیں جب کہ یہی اوصاف اسلام کی روح ہیں۔ امجؔد کس دردمندی کے ساتھ اس رباعی میں مسلمانوں کی غلط روش کی طرف توجہ دلاتے ہیں۔ رباعی ملاحظہ کریں:

دل ہے سینے میں، دل میں ایمان نہیں　　کہنے کو تو زندہ ہیں مگر جان نہیں
سب کہتے ہیں: دنیا میں مسلماں ہیں تباہ　　ہم کہتے ہیں: دنیا میں مسلمان نہیں

اسلام کی موجودہ حالت کے تناظر میں یہ رباعی ملاحظہ کریں:

اِس دین کے آگے سَر جھکاتے تھے تمام　　کرتا نہیں اب کوئی مسلماں کو سلام
پستی نے بنا دیا ہے پائے طاؤس　　نقشِ پرِ طاؤس تھا پہلے اسلام

پیری (بڑھاپے) کے تعلق سے امجد کی یہ دو رباعیاں ملاحظہ کریں:

اِس عالَمِ ہستی سے سفر کرتے ہیں　　ہر چیز پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
پیری میں پھٹکتا نہیں پاس اپنے کوئی　　گرتی دیوار سے حذر کرتے ہیں

☆

ہر وقت یہ غیب سے صدا آتی ہے　　ہشیار کہ فرقت کی بلا آتی ہے
جھکتی ہے کمر جائے لحد ڈھونڈنے کو　　پیرایۂ پیری میں قضا آتی ہے

حالات موجودہ پر نازاں نہ ہونے اور دنیا کی ناپائیداری پر یہ رباعیاں ملاحظہ کریں:

زیبائش و تزئیں پہ نظر ہوتی ہے　　آخر کی بھی کچھ تجھے خبر ہوتی ہے
یہ موئے سیہ، سپید ہوں گے اک دن　　امجؔد! ہر شام کی سحر ہوتی ہے

☆

دو روز کے واسطے یہاں آتے ہیں　　اِس پر بھی ہمیشہ رنج وغم کھاتے ہیں
دَم بھر کے لئے بساطِ دنیا پر لوگ　　مُہرے کی طرح بیٹھ کے اُٹھ جاتے ہیں

فقیر کی مستی، بے نیازی کے تعلق سے یہ رباعی بھی ملاحظہ کریں:

ہر وقت خدا پر جو نظر رکھتے ہیں کب دل میں خیالِ سیم وزَر رکھتے ہیں
شاہوں کو ہو بحر و بر مبارک امجدؔ عاشق لبِ خشک وچشمِ تَر رکھتے ہیں

پری روچہروں اورحسینوں دوری اختیار کرنے کا اشارہ اس رباعی میں ملاحظہ کریں:

لبریز نہ کر عمر کے پیمانے کو اَفسوں سمجھ اِس حُسن کے افسانے کو
بہتر ہے حسینوں سے کنارہ امجدؔ ہے قہر وصالِ شمع، پروانے کو

امجدؔ کی رباعیاں اسلوب بیان کی سادگی اور سلاست سے مزین اور امجد کے دلی جذبات کی آئینہ دار ہیں۔ یہی بنا ہے کہ امجدؔ کی آواز میں تاثیر ہے اور یہی تاثیر ان کو ایک عظیم رباعی گو شاعر بناتی ہے۔ اس لئے یہ وثوق کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں کہیں بھی رباعی کا ذکر آئے گا وہاں امجدؔ کا نام ضرور لیا جائے گا۔ امجدؔ حیدرآبادی کے نام کے بغیر اردو رباعی کی تاریخ نامکمل وناقص رہے گی۔

06.05 رباعیاتِ امجدؔ ''اقتباس''

﴿۱﴾

کب تک ہے بقائے تن؟ فنا کو معلوم کب تک ہے یہ زندگی؟ قضا کو معلوم
ہر سانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے جاتی تو ہوں، واپسی خدا کو معلوم

﴿۲﴾

مَیں کیا جانوں کہ کل کے دن کیا ہوگا؟ لیکن جو کچھ بھی ہوگا ، اچھا ہوگا
کی جس نے یہاں پرورش آخر دم تک واں بھی وہی کارساز اپنا ہوگا

﴿۳﴾

بحرِ متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دَم طرفِ لحد کھنچا جاتا ہوں
بازارِ فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے میں صرف کفن لے کے چلا جاتا ہوں

﴿۴﴾

سانچے میں اَجل کے ہرگھڑی ڈھلتی ہے ہر وقت یہ شمعِ زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اندر باہر یا عُمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

﴿۵﴾

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی نادان کو اُلٹا بھی تو نادان رہا

﴿۶﴾

کوشش ہے تمام اپنی ستائش کے لئے　　کیا کیا کرتے ہیں ایک خواہش کے لئے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے　　پُتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لئے

﴿۷﴾

بیکس ہوں، نہ مال ہے، نہ سرمایا ہے　　مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لایا ہے؟
یارب! تری رحمت کے بھروسے امجدؔ　　بند آنکھ کیے یوں ہی چلا آیا ہے

﴿۸﴾

سجدہ میں جب انہماک ہو جاتا ہے　　نفسِ سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مُسلم کے لئے عجیب نعمت ہے نماز　　سرخاک میں رکھ کے پاک ہو جاتا ہے

﴿۹﴾

لے لے کے خدا کا نام چلّاتے ہیں　　پھر بھی اثرِ دُعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز　　کرتے نہیں پرہیز، دوا کھاتے ہیں

﴿۱۰﴾

ہر قطرے میں بحرِ معرفت مضمر ہے　　ہر اک ذرّہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی　　گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

06.06 رباعیاتِ امجدؔ ''تشریح''

کب تک ہے بقائے تن؟ فنا کو معلوم　　کب تک ہے یہ زندگی؟ قضا کو معلوم
ہرسانس یہ کہہ رہی ہے جاتے جاتے　　جاتی تو ہوں، واپسی خدا کو معلوم

اس رباعی میں امجد نے زندگی کا فلسفہ پیش کیا ہے۔آپ کہتے ہیں کہ ہمارا جوتن (جسم) ہے اس کو کب تک باقی رہنا ہے اِس سوال کا جواب تو صرف اورصرف فنا (موت) کو معلوم ہے۔مصرعہ ثانی میں بھی یہی بات کہی ہے کہ ہماری زندگی کی آخری شب کب ہوگی؟ یہ بھی قضا (موت) کو معلوم ہے۔ یہاں تک کہ ہماری سانسوں کی بھی آمدورفت یہی کہہ رہی ہیں کہ میں جاتی تو ہوں مگر میری واپسی کا راز صرف اور صرف خدائے تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

مَیں کیا جانوں کہ کل کے دن کیا ہوگا؟　　لیکن جو کچھ بھی ہوگا ، اچھا ہوگا
کی جس نے یہاں پرورش آخر دم تک　　واں بھی وہی کارساز اپنا ہوگا

اس رباعی کا فلسفہ یہ ہے کہ امجد کہتے ہیں میں کیا جانوں کہ کل (قیامت) میں کیا ہوگا۔یعنی وہاں زندگی کے متعلق تمام امور میں فیصلہ ہونے والا ہے۔لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہاں جو کچھ بھی ہوگا ان شاءاللہ اچھا ہوگا۔وہ یہ بات اس لئے کہتے ہیں کہ جس کے وسیلہ نے دنیا

کے اندر آخری سانس تک پرورش و پرداخت کی ۔کل وہی کارساز، چارہ گر،محسن انسانیت،شفیع روزِ شمار ہی اپنا ہوگا۔یعنی محبوب رب حضور کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میری لاج رکھ لیں گے اور اس ناچیز کی شفاعت بھی فرمائیں گے۔

بحرِ متلاطم میں بہا جاتا ہوں ہر دَم طرفِ لحد کھنچا جاتا ہوں
بازارِ فنا میں کیا ٹھہرنا ہے مجھے مَیں صرف کفن لے کے چلا جاتا ہوں

اس رباعی میں امجد نے زندگی وموت کو پیش کیا ہے۔کہ میں بحرِ متلاطم (زندگی کی بھول بھلیّوں) میں اس طرح بہا جارہا ہوں کہ جس طرح جب سمندر میں طغیانی آئی ہوئی ہوتو اس میں آپ چشمِ تصور سے کسی انسان یا کسی چیز کو ملاحظہ کریں تو آپ پر یہ منکشف ہوگا کہ وہ انسان یا چیز کس طرح سمندر کے تھپیڑوں کی زد پر اوپر نیچے دائیں بائیں اچھلتی کودتی بہی جارہی ہے یہی میری زندگی کی حقیقت ہے۔اس طرح سے ہر وقت یا ہر سانس میں لحد کی جانب کھنچتا چلا جاتا ہوں۔اور دنیا ایک فانی بازار ہے جس طرح دنیا میں شام ہوتے ہوتے بازار ختم ہونے لگتی ہے اور ہر ضرورت منداپنی ضرورت کی چیز خرید کر بازار میں نہیں ٹھہرتا بلکہ چلا جاتا ہے ٹھیک یہی حال حضرت انسان کا ہے کہ دنیا میں صرف اتنی دیر ٹھہرتا ہے کہ جتنا وقت انسان بازار میں ٹھہرتا ہے۔مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا میں صرف اتنے وقت کے لئے تشریف لایا ہے کہ وہ ادھر اپنا کفن خریدے اور اپنے آخری آرام گاہ کی طرف واپس ہو جائے۔

سانچے میں اَجل کے ہر گھڑی ڈھلتی ہے ہر وقت یہ شمعِ زندگی جلتی ہے
آتی جاتی ہے سانس اَندر باہر یا عُمر کے حلق پر چھری چلتی ہے

اس رباعی میں زندگی وموت کے تعلق سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موت کے سانچے میں زندگی ہر گھڑی، ہر پل، ہر وقت ڈھل (ختم) رہی ہے۔اسی طرح زندگی کی شمع ہمہ وقت جلتی ہے۔آخر میں یہ شمع ختم ہو جاتی ہے۔دوسرے پیرائے میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ تمام ذی روح کے سانس کے زیروبم یعنی سانس کا آنا جانا ہی اس کی زندگی کی دلیل ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی دلالت کرتی ہے کہ سانس کا اندر باہر ہونا اصل میں یہ عمر کے حلق پر چھری کا چلنا ہے۔

ہم صحبت بے خرد پریشان رہا نافہم کو سمجھا کے پشیمان رہا
تعلیم سے جاہل کی جہالت نہ گئی نادان کو اُلٹا بھی تو نادان رہا

اس رباعی میں امجد نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ اگر جس کی عادت (جبلت ،فطرت،سرشت) میں بیوقوفی ہو وہ اگر چہ عقل مندوں کی صحبت میں بھی بیٹھتا رہے۔پھر بھی وہ پریشان رہے گا۔کیوں کہ جس کے اندر سمجھنے کا مادہ نہیں ہوگا اس کو سمجھانے والا بھی خود ہی شرمندہ وپشیمان رہے گا۔یعنی جس کی جبلت میں جہالت ہی بھری ہوئی ہے اس کو تعلیم کے ذریعے بھی دور نہیں کیا جاسکتا۔اس کا مسئلہ تو یہی ہے کہ وہ پڑھ لکھ کر بھی جاہل ہی رہے گا جس طرح کہ (ن۔ا۔د۔ا۔ن) سیدھا یا اُلٹا جیسے بھی پڑھو گے نادان ہی رہے گا۔

کوشش ہے تمام اپنی ستائش کے لئے کیا کیا کرتے ہیں ایک خواہش کے لئے
ہر ایک نمود پر مٹا جاتا ہے پُتلے مٹی کے ہیں نمائش کے لئے

اس رباعی کا مرکز ومحور خودنمائی ہے۔اس میں امجدؔ نے انسانی خواہشات میں سے ایک خواہش خودنمائی پر روشنی ڈالی ہے۔آپ کہتے ہیں کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے اپنی تمام کوششیں اپنی ستائش یعنی تعریف وتوصیف کے لئے کرتا ہے یعنی اپنے کام اس طرح سے انجام دیتا ہے کہ لوگ اس کی بڑائی بیان کریں اسی اک خواہش کو پورا کرنے کے لئے لاکھوں طرح کے جتن کرتا ہے یعنی انسان خودنمائی کے لئے بے شمار دولت کو پانی کی طرح بہادیتا ہے تاکہ اس کی زمانے میں واہ واہی ہوجائے۔ ہرایک نمود پر مرنے اور مٹنے کو تیار ہوجاتا ہے۔امجد کہتے ہیں کہ تم خود ہی مٹّی کے پتلے ہواور نمائش کے لئے ہو۔

بے کس ہوں، نہ مال ہے، نہ سرمایا ہے　　　مجھ سے کیا پوچھتا ہے، کیا لایا ہے؟
یارب! تری رحمت کے بھروسے امجدؔ　　　بند آنکھ کیے یوں ہی چلا آیا ہے

اس رباعی میں امجد نے قیامت کے دن حساب وکتاب یعنی اعمال کی پرشش کے بارے میں بات چیت کی ہے۔کہتے ہیں اگراللہ رب العزت مجھ سے پوچھے گا تو میں تو عرض کروں گا کہ اے ستاروغفار میں بیکس ہوں نہ میرے پاس نیکیاں ہے اور نہ ہی کوئی ایسا صدقات کا سرمایہ ہے جس کو میں تیرے حضور پیش کرسکوں یعنی میرے اعمال نامہ میں سوائے خطاؤں کے کچھ بھی نہیں ہے۔اے میرے پاک پروردگار میں تیری رحمت کے آسرے وبھروسے پر اپنی آنکھیں بند کیے تیری بارگاہِ بیکس پناہ میں حاضر آیا ہوں۔

سجدہ میں جب انہاک ہو جاتا ہے　　　نفسِ سرکش ہلاک ہو جاتا ہے
مُسلم کے لئے عجیب نعمت ہے نماز　　　سرخاک میں رکھ کے پاک ہوجاتا ہے

اس رباعی میں امجدؔ نے نماز کی اہمیت وعظمت کے متعلق چند نکات کو بیان کیا ہے۔آپ کہتے ہیں کہ جب انسان اللہ رب العزت کے حضور سجدہ ریز ہوتا ہے اور جب اس کے سجدے میں انہاک یعنی خضوع وخشوع کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے تو اس سے نفس کی سرکشی دور ہو جاتی ہے وہ ہلاک ہوجاتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے امت مسلمہ کے لئے نماز ایک اہم نادر ونایاب تحفہ ہیں کہ جب انسان نماز میں مشغول ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے بہت قریب ہوجاتا ہے اور سر جب سجدے میں رکھتا ہے تو اس کا سرغرور وتمکنت سے پاک ہوجاتا ہے۔یہی اس رباعی کا خلاصہ اور ماحصل ہے۔

لے لے کے خدا کا نام چِلّاتے ہیں　　　پھر بھی اَثرِ دُعا نہیں پاتے ہیں
کھاتے ہیں حرام لقمہ، پڑھتے ہیں نماز　　　کرتے نہیں پرہیز، دَوا کھاتے ہیں

امجدؔ اس رباعی میں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ عوام الناس! اللہ رب العزت کا نام اپنے اپنے طور طریقوں سے لے لے کر چلّاتے ہیں یعنی دُعاء مانگتے ہیں مگر پھر بھی اس میں اثر دعا پیدا نہیں ہوتا ہے۔لیکن امجد اس کی توجیہ یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ لقمۂ حرام کھانے کے بعد اپنے معبود کی عبادت کرتے ہیں یہ تو ٹھیک ایسا ہی جیسا کہ کوئی انسان دوا کھاتا رہے اور پرہیز بالکل نہ کرے۔تو اس دعا میں اثر کیسے پیدا ہو سکے گا اور وہ کس طرح رب کی بارگاہ میں قبولیت کے شرف سے مشرف ہوگی۔

ہر قطرے میں بحرِ معرفت مضمر ہے　　　ہر اک ذرّہ میں کچھ نہ کچھ جوہر ہے
ہو چشمِ بصیرت تو ہے ہر چیز اچھی　　　گر آنکھ نہ ہو تو لعل بھی پتھر ہے

امجدؔ اس رباعی میں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا کی ہر شئے میں علم پوشیدہ ہے۔علم تو محنت کے ذریعے حاصل کرنا ممکن ہے لیکن عرفان تک رسائی غور وفکر سے ہوتی ہے۔ بار ہا ایسا ہوتا ہے کوئی چیز معمولی سی نظر آتی ہے جیسے ایک قطرہ جس کی پہلی نگاہ میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر غور وفکر کی جائے تو اس میں معرفت کا ایک سمندر موجزن ہوتا ہے۔جیسا کہ ذرّہ بے حقیقت سہی لیکن اس میں کوئی نہ کوئی جوہر ضرور ہوتا ہے جس کو دیکھنے کے لئے آنکھ چاہیے اور اگر چشم بصیرت نہ ہو تو لعل بھی پتھر کے برابر ہوگا۔صوفیائے کرام نے معرفت کو معراجِ آدم قرار دیا ہے۔وہ ہر شئے میں خدا کے جلوے کا مشاہدہ کرتے ہیں اسی وجہ سے امجدؔ کہتے ہیں کہ اگر چہ ایک قطرہ کی ظاہراً کوئی حیثیت نہیں لیکن اگر غور وفکر سے دیکھا جائے تو اس میں معرفت کا ایک سمندر پوشیدہ ہے مگر شرط یہ ہے کہ انسان اپنے آپ میں بصیرت پیدا کرے اور ذرّے میں چھپے ہوئے جوہر کو پہچانے ورنہ اس کا حال اس اندھے کے جیسے ہوگا جسے لعل مل جائے مگر وہ اسے پتھر سمجھ کر پھینک دے۔

09.07 سید احمد حسین امجد امجدؔ حیدرآبادی کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

ہر گام پہ چکرا کے گرا جاتا ہوں نقشِ کفِ پا بن کے مٹا جاتا ہوں
تُو بھی تو سنبھال میرے دینے والے! مَیں بارِ امانت میں دَبا جاتا ہوں

﴿۲﴾

غم سے ترے اپنا دل نہ کیوں شاد کروں جب تُو سُنتا ہے ،کیوں نہ فریاد کروں
مَیں یاد کروں تو ، تُو مجھے یاد کرے تُو یاد کرے ، تو مَیں نہ کیوں یاد کروں

﴿۳﴾

دنیا نہیں ، جائے کامرانی کے لئے مجلس یہ نہیں مرثیہ خوانی کے لئے
جب مَاقَدَرُوْاللّٰہ خدا کہتا ہے کیا روتے ہو اپنی قدر دانی کے لئے؟

﴿۴﴾

خود اپنی ہی ذات سے محبت کیجیے جتنا ممکن ہو ، اپنی عزت کیجیے
مجموعۂ آیاتِ الٰہی ہے یہی قرآنِ وجود کی تلاوت کیجیے

﴿۵﴾

اَفیون ہو یا مٹھائی ، منہ میں رکھ لی چیز اپنی ہو یا پرائی ، منہ میں رکھ لی
چھوٹے بچوں سے کم نہیں ہم اب بھی جو چیز ملی ، اُٹھائی ، منہ میں رکھ لی

﴿۶﴾

اِس سینہ میں کائنات رکھ لی مَیں نے کیا ذکرِ صفات ، ذات رکھ لی مَیں نے
ظالم سہی ، جاہل سہی ، نادان سہی سب کچھ سہی، تیری بات رکھ لی مَیں نے

﴿۷﴾

مَر مَر کے لحد میں، مَیں نے جا پائی ہے یاں تک مجھے تیری ہی کشش لائی ہے
آ اے مِرے منہ چھپانے والے آجا خلوت ہے، شبِ تار ہے، تنہائی ہے

﴿۸﴾

ناحق پھر پھر کے سَر پھرایا مَیں نے اپنی کوشش سے کچھ نہ پایا مَیں نے
طوفان میں ہے کشتیِ اُمید مِری لے تُو ہی سنبھال، ہاتھ اُٹھایا مَیں نے

﴿۹﴾

کم ظرف اگر دولت و زَر پاتا ہے مانندِ حباب اُبھر کے اِتراتا ہے
کرتے ہیں ذرا سی بات میں فخر خسیس تنکا، تھوڑی ہوا سے اُڑ جاتا ہے

﴿۱۰﴾

دریائے محبت ہے سفینہ میرا ہے حُسن کی خاتم پہ نگینہ میرا
روشن ہے چراغِ عشق سے کعبۂ دل معمور ہے نور سے مدینہ میرا

﴿۱۱﴾

حیرت نہیں، بے سایہ اگر ذات ہوئی ٹکڑے کیا چاند، کیا کرامات ہوئی
دن رات تھا جلوۂ خدا پیشِ نظر معراج ہوئی تو کیا نئی بات ہوئی؟

﴿۱۲﴾

ہیں خاتمِ عشق کا نگینہ آنکھیں ہیں بحرِ محبت کا سفینہ آنکھیں
ہیں گنبدِ پُر نور کی صورت بالکل کعبہ ہے اگر دل تو مدینہ آنکھیں

﴿۱۳﴾

زنجیرِ دَرِ عرش ہلاتا ہوں مَیں اللہ غنی کسے بلاتا ہوں مَیں
سجدے کے بہانے دل کی بے تابی سے قدموں پہ کسی کے لوٹ جاتا ہوں مَیں

﴿۱۴﴾

انسان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں ہر جان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں
یہ کلمۂ طیبہ کے دو جزو نہیں ایمان کی زندگی کی دو سانسیں ہیں

﴿۱۵﴾

تنہائی میں فریاد تو کر سکتا ہوں ویرانے کو آباد تو کر سکتا ہوں
جب چاہوں مَیں گو مل سکتا تجھ سے جب چاہوں تجھے یاد تو کر سکتا ہوں

﴿۱۶﴾

کچھ اپنا پتہ اُس نے بتایا تو نہیں
اب تک اُس کا سراغ پایا تو نہیں
مِلتی ہوئی ہے دل کی کھٹک آہٹ سے
دیکھو دیکھو کہیں وہ آیا تو نہیں؟

﴿۱۷﴾

ہر دَم اُس کی عنایتِ تازہ ہے
اُس کی رحمت بغیر اَندازہ ہے
جتنا ممکن ہو ، کھٹکھٹائے جاؤ
یہ دستِ دعا خدا کا دروازہ ہے

﴿۱۸﴾

تَن کی کشتی میں نوح بن کر آیا
ساغر میں مِرے صبوح بن کر آیا
خَیرٌ مِّنْ الفِ شَھرٌ ہے آج کی رات
وہ پیکرِ جاں میں رُوح بن کر آیا

﴿۱۹﴾

بے خودمَیں رہوں تو وہ قریں آتا ہے
پردہ ہی میں وہ پردہ نشیں آتا ہے
وہ جب آتا ہے ،مَیں نہیں رہتا ہوں
مَیں جب رہتا ہوں ، وہ نہیں آتا ہے

﴿۲۰﴾

ٹُوٹا ہوا دل یادِ خدا کرتا ہے
عاشق ہی اَدائے ناز پر مَرتا ہے
رہتا ہے دلِ شکستہ میں عرش نشیں
یہ جام عجب ہے ، ٹُوٹ کر بَھرتا ہے

06.08 خلاصہ

امجد کا پورانام سیدامجد حسین تھا۔عہد طفلی میں ہی امجد کے والدمحترم کا انتقال ہوگیا تھا۔پھراس کےان کی پرورش وتربیت آپ کی والدہ ماجدہ صوفیہ بیگم نے کی تھی۔آپ بہت نیک،متقی اور پرہیزگارتھی۔آپ کی ہی تربیت کا یہ ثمرہ تھا کہ تصوف،قناعت،متانت،پرہیزگاری اورسادگی امجد کے مزاج کے اجزائے ترکیبی بنے۔ابتدائی تعلیم آپ کی جامعہ نظامیہ حیدرآباد میں ہوئی۔امجد نے اس کے بعد میں پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کاامتحان پاس کیا۔ایک قلیل عرصہ تک آپنے درس وتدریس کےفرائض انجام دیئے اس کے بعد آپ صدرمحاسبی کے شعبہ میں ملازم ہوگئے اورآپ ترقی کرتے ہوئے ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل کے عہدے پچپن برس کی عمر میں وظائف پرسبکدوش ہوئے۔اسی سال حیدرآباد کی موسیٰ ندی والا حادثہ پیش آیا جس میں آپ کے اہل خانہ دریابردہوگئے۔

آپ کی رباعیاں پورے ہندوستان میں مشہورومقبول ہیں اورعوام وخواص کی زبان پرجاری وساری ہیں۔اپنی رباعیوں کے ذریعہ امؔجد نے عوام کے اخلاقی معیار بلندکرنے کی کوشش کی ہے۔رباعی میں آپ نے انسانی اقدارکوبہت سادہ اورمنفردانداز میں پیش کیاہے۔اخلاق ومعرفت اورزندگی کی اقدار کے بارے میں نہایت سادہ اور پراثر انداز میں تلقین ملتی ہے۔امؔجد کے مزاج میں تصوف سرایت کیے ہوئے

تھا۔اسی لئے امجد کی رباعیوں میں تصوف کے نازک پہلو بھی نظر آتے ہیں۔امجد کی شاعری میں زبان کی سلاست ایک اہم اور خصوصی وصف ہے۔وہ روزمرہ کی زندگی کے عام مسائل کو بہت ہی سادگی اور نصیحت آمیز اور نرم لب و لہجے میں پیش کی قدرت پر عبور رکھتے ہیں۔چوں کہ امجد خود اعلیٰ انسانی اقدار پر یقین رکھتے ہیں اسی لئے امجد کی کہی ہوئی بات دل میں اُتر جاتی ہے۔

اردو ادب میں امجد حیدر آبادی کی حیثیت رباعی گو شاعر کی ہے۔غرض یہ کہ آپ نے اس اکائی میں ان کے حالاتِ زندگی اور ان کی دس رباعیوں کا مطالعہ کیا ہے۔امید کی جاتی ہے کہ آپ اس اکائی کے مطالعے کے بعد امجد کے تعلق سے آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا۔بہرحال رباعی کی تاریخ میں امجد کے سرمائے نے ان کو زندہ و جاوید کردیا ہے۔

06.09 فرہنگ

اعجاز	: بڑا کام	سحر	: صبح
افیون	: افیم، تریاق	سبکدوش	: ریٹائرمینٹ
بازارِفنا	: ختم ہونے والا بازار مراد یہ دنیا	سیم وزر	: چاندی اور سونا
بےخرد	: عقل سے کورا	شبِ تار	: اندھیری رات
پالکی	: ایک سواری کا نام	قرب وجوار	: پاس، نزدیک
پائے طاؤس	: مور کے پیر، مراد پستی	کلاہ	: ٹوپی
پرِطاؤس	: مور کا پر، مراد بلندی	گورِپدر	: باپ کی قبر
پیشہ	: کام، ہنر	لحد	: قبر
تربیت	: پالنا، پرورش کرنا	محسنِ انسانیت	: انسانیت پر احسان کرنے والے مراد حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
ثمرہ	: پھل		
حذر	: پرہیز، بچاؤ	نام وَر	: مشہور، معروف
درسگاہ	: علم حاصل کرنے کی جگہ	نمود	: دکھاوٹ، شان
ذہنی کرب	: ذہنی طور پر دکھ ہونا	نومولود	: نیا پیدا ہوا، نیا نیا

06.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱ امجد کی تصنیفات پر اپنے معلومات سپرد قرطاس کیجیے؟

سوال نمبر۲ امجد کی رباعیوں کے اہم موضوعات پر اپنی آراء کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر۳ امجد کی دو رباعیاں پیش کرتے ہوئے ان کا مفہوم بھی واضح کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱ امجد کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتائیے؟

سوال نمبر۲ امجد کی شاعری میں تصوف کے عناصر کی نشان دہی کیجیے؟

سوال نمبر۳ امجد کی رباعیوں کی اہم خصوصیات مع امثلہ بیان کیجیے؟

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : امجد حیدرآبادی کا پورا نام کیا ہے؟

(الف) سید احمد حسین (ب) سید محمد حسین (ج) سید حامد حسین (د) سید محمود حسین

سوال نمبر۲ : امجد حیدرآبادی کس شہر میں پیدا ہوئے؟

(الف) دہلی میں (ب) حیدرآباد میں (ج) لکھنؤ میں (د) ممبئی میں

سوال نمبر۳ : امجد حیدرآبادی کے اہلِ خانہ کس ندی میں سیلاب کی نذر ہو گئے؟

(الف) جمنا ندی میں (ب) گنگا ندی میں (ج) موسیٰ ندی میں (د) راپتی ندی میں

سوال نمبر۴ : امجد حیدرآبادی کی دوسری بیوی کا نام کیا ہے؟

(الف) نہال سلمیٰ (ب) عسال سلمیٰ (ج) کمال سلمیٰ (د) جمال سلمیٰ

سوال نمبر۵ : امجد حیدرآبادی کی پہلی نظم کون سی ہے؟

(الف) دنیا اور انسان (ب) انسان (ج) دنیا (د) دنیا دارالمکافات

سوال نمبر۶ : مولوی وحیدالدین سلیم پانی پتی کس کو ''زندہ سرمد'' کہا کرتے تھے؟

(الف) جگر مرادآبادی کو (ب) امجد حیدرآبادی کو (ج) جوش ملیح آبادی کو (د) میرانیس کو

سوال نمبر۷ : ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کس کو پہلا اور آخری رباعی گو شاعر کہا ہے؟

(الف) جوش ملیح آبادی کو (ب) میرانیس کو (ج) امجد حیدرآبادی کو (د) مرزا دبیر کو

سوال نمبر۸ : رباعی کے کتنے اَوزان ہیں؟

(الف) ۱۷ (ب) ۱۵ (ج) ۳۴ (د) ۲۴

سوال نمبر۹ : ''رباعی'' میں کتنے مصرعے ہوتے ہیں؟

(الف) ۴ (ب) ۲ (ج) ۶ (د) ۸

سوال نمبر۱۰ : ''رباعیات'' کا واحد لفظ کیا ہے؟

(الف) ربیع (ب) رباعی (ج) رُبع (د) رابع

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر ۱ : (الف) سید احمد حسین	جواب نمبر ۶ : (ب) امجؔد حیدرآبادی کو
جواب نمبر ۲ : (ب) حیدرآباد میں	جواب نمبر ۷ : (ج) امجؔد حیدرآبادی کو
جواب نمبر ۳ : (ج) موسیٰ ندی میں	جواب نمبر ۸ : (د) ۲۴
جواب نمبر ۴ : (د) جمال سلمیٰ	جواب نمبر ۹ : (الف) ۴
جواب نمبر ۵ : (الف) دنیا اور انسان	جواب نمبر ۱۰ : (ب) رباعی

06.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ رباعیاتِ امجؔد از امجد حیدرآبادی

۲۔ دکن میں اردو از نصیر الدین ہاشمی

۳۔ حیاتِ امجؔد از محمد جمال شریف

✵

اکائی 07 : جگت موہن لال رواںؔ (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

07.01 : اغراض ومقاصد
07.02 : تمہید
07.03 : جگت موہن لال رواںؔ کے حالاتِ زندگی
07.04 : جگت موہن لال رواںؔ بحیثیتِ رباعی گو
07.05 : رباعیاتِ رواںؔ (اقتباس)
07.06 : رباعیاتِ رواںؔ (تشریح)
07.07 : جگت موہن لال رواں کی منتخب دیگر رباعیاں
07.08 : خلاصہ
07.09 : فرہنگ
07.10 : سوالات
07.11 : حوالہ جاتی کتب

07.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی کے تحت اردو کے مشہور رباعی گو شاعر جگت موہن لال رواںؔ کی ادبی خدمات کا عمومی اوران کی رباعی گوئی کا خصوصی جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ رواںؔ کی رباعی گوئی کی امتیازی خصوصیات کیا تھیں اس اکائی میں اس پر مثالوں کی روشنی میں گفتگو ہوگی نیز سرسری طور سے رباعی کے فن، ابتدا اور روایت پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، اس کے علاوہ ان کی دس رباعیاں جو کہ شاملِ نصاب ہیں ان کا متن اوران کی تشریح بھی کی جائے گی تاکہ رواںؔ کی انفرادیت واضح اور روشن ہوسکے۔ اکائی کے آخر میں خلاصہ، الفاظ ومعانی اور بطورِ نمونہ امتحانی سوالات بھی دیئے جائیں گے اور ساتھ ہی بالکل آخر میں حوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی دی جائے گی جس سے کہ آپ ان کتابوں کے ذریعے اپنی معلومات میں جگت موہن لال رواںؔ کے تعلق سے اضافہ کرسکیں گے۔

07.02 تمہید

رباعی کی صنف کی ابتدا کا دامن اگر چہ اردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ بندھا ہوا ہے، یعنی تقریباً تمام اہم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن رباعی گوئی کو صحیح معنوں میں وقار اور مقام بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوا۔

یوں تو رباعی گوشعرا کے بڑے اوراہم نام وہی ہیں جواردوغزل اوردیگراصناف میں بھی اپنی انفرادیت تسلیم کرا چکے ہیں یعنی میر وسودا اوردرد، مصحفی، انشااورجرأت، انیس ودبیر، حالی، اکبراوریگانہ وغیرہ؛ لیکن بیسویں صدی میں جن شعرا کی شناخت محض رباعی گوئی کی بنیاد پر قائم ہوئی ان میں امجد حیدرآبادی کے علاوہ جگت موہن لال رواں کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

07.03 جگت موہن لال رواں کے حالاتِ زندگی

جگت موہن لال رواں کے آباواجداد کا تعلق سیتاپور کے کائستھوں کے ایک معزز خاندان سے تھا۔ان کے جدامجد بخشی مہی لال شاہانِ اودھ کی فوج میں منشی کے عہدے پر فائز تھے،لیکن جب ۱۸۵۷ء کے ناکام انقلاب کے بعدانگریزحکومت کواستحکام حاصل ہوگیا تو رواں کے جدامجد کوان کے عہدہ سے سبک دوش کردیا گیا۔مجبوراً بخشی مہی لال نے سیتاپور کوخیرباد کہا اوراپنی سسرال ضلع اناؤ میں سکونت پذیر ہوگئے اورروزی روٹی کے لئے کھیتی باڑی شروع کردی۔یہیں رواں کے والدگنگاپرشاد کی تعلیم وتربیت ہوئی اوراسی شہر میں وہ مختاری کرنے لگے۔

رواں اپنے والدین کے چوتھے فرزند تھے۔ان کی پیدائش جنوری ۱۸۸۹ء میں بمقام اُناؤ ہوئی تھی۔یہیں انہوں نے اردوفارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی، جہاں انہیں مولوی سبحان اللہ خاں جیسے شفیق استاد کی رہنمائی میں استفادے کا موقع ملا۔رواں ابھی نو برس کے تھے کہ والدانتقال فرما گئے اورسلسلۂ تعلیم عارضی طور سے منقطع ہوگیا۔نویں جماعت میں تھے کہ والدہ بھی قضائے الٰہی سے فوت ہوگئیں لیکن رواں نے عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا اوراپنی تعلیم جاری رکھی۔۱۹۰۷ء میں انہوں نے اوّل درجہ میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اورمزید تعلیم کے لئے لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں کیننگ کالج میں داخلہ ملا اور۱۹۰۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی درجۂ اوّل میں پاس کرلیا۔ان کواس مرتبہ کالج کی طرف سے نقرئی تمغے کے ساتھ ساتھ مزید تعلیم کے لئے وظیفۂ علمی بھی مل گیا۔ چنانچہ رواں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور بی.اے میں داخلہ لیا اور انگریزی ادب، فارسی اورفلسفہ کے ساتھ ۱۹۱۱ء میں بی.اے بھی امتیازی نمبروں کے ساتھ پاس کرلیا۔کیننگ کالج سے ہی ۱۹۱۳ء میں انگریزی ادب سے ایم.اے کا امتحان پاس کیا اورپھر ۱۹۱۶ء میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل.ایل. بی کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔

تعلیم کی تکمیل کے بعدرواں نے حصولِ رزق کے لئے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔وہ اُناؤ میں آکراس پیشے سے منسلک ہوگئے اورجلد ہی ان کا شماراُناؤ کے ممتاز وکلا میں کیا جانے لگا۔رواں اگرچہ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے متعارف اورمشہور ہوچکے تھے لیکن شاعری کے مقابلے میں وکالت کووہ اپنی طبیعت اورافتادِمزاج کے منافی خیال کرتے تھے۔وہ ایک علم پروراورعلم دوست شخص تھے جوبدرجۂ مجبوری وکالت کے پیشہ سے روزی روٹی حاصل کرتے تھے۔وکالت سے اپنی بےاطمینانی کا اظہارانہوں نے مثنوی ''نقدرواں'' میں بھرپورطور پر کیا ہے۔

رواں کی بیش ترتعلیم وتربیت چوں کہ لکھنؤ کے علمی اورادبی ماحول میں ہوئی تھی اس لئے اس ادبی اورعلمی شہر کی نشستوں اورادبی محافل کے اثرات ان کی شخصیت اورشاعری پربھرپورطور سے نظرآتے تھے۔اپنے ادبی مذاق کی سیری کے لئے انہوں نے قیام اناؤ کے دوران مختلف ادیبوں اورشاعروں کی محفلیں چھوٹے سے قصبہ میں آبادکررکھی تھیں، چنانچہ جگرمرادآبادی، سیماب اکبرآبادی، جوش ملیح آبادی،عزیزلکھنوی، پنڈت آنندنرائن ملا،فراق گورکھ پوری، منشی دیانرائن نگم اورنواب جعفرعلی خاں اثرلکھنوی جیسے ادیب اورشاعروں کی بدولت اُناؤ میں ادبی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں،اوران کے روحِ رواں جگت موہن لال رواں ہوا کرتے تھے۔

شاعری عطیۂ خداوندی ہے۔ یہ جوہر فطرت کی جانب سے انسان کی طبیعت میں ودیعت کیا جاتا ہے۔ اکتساب اور مشق سے اس میں مہارت بہم پہنچائی جاسکتی ہے۔ رواںؔ کے حالاتِ زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جذبہ انہیں فطرت کی طرف سے ودیعت ہوا تھا۔ ان کے اندر شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔کم عمری میں ہی ان سے شعر سرزد ہونے لگے تھے۔بچپن سے ہی موزوں طبع تھے اس جوہر پر صیقل گری کا کام لکھنؤ کے مشہور استاد مولانا مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی نے کر دیا۔عزیزؔ لکھنوی کے شاگردوں میں جوشؔ اور آثرؔ لکھنوی کے علاوہ کسی نے شہرت کی بلندی حاصل کی تو وہ رواںؔ ہی تھے،جنہوں نے رباعیات کے علاوہ دیگر اصنافِ شعری میں اپنا مقام پیدا کیا۔

رواںؔ کا شمار بھی جواں مرگ شاعروں میں ہوتا ہے۔ان کی سوانح حیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑے زندہ دل اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے۔طبیعت بڑی شاہانہ پائی تھی۔حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور دوستوں کی معیت میں سیر وشکار کا مشغلہ رہا کرتا تھا۔ایک دن شکار سے واپس ہوئے تو بخار کے ساتھ سر میں شدید درد تھا۔علاج ہوا مگر افاقہ کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی اور آخر کار محض پینتالیس برس اور آٹھ مہینے کی حیاتِ عارضی کے بعد ستمبر ۱۹۳۴ء کو وہ معبودِ حقیقی سے جا ملے۔

07.04 جگت موہن لال رواںؔ بحیثیتِ رباعی گو

اردو میں رباعی کا آغاز فارسی شاعری کے زیر اثر ہوا۔دکنی شعرا نے رباعیوں کی جانب توجہ کی۔کم وبیش تمام اہم شعرا کے کلام میں رباعیاں موجود ہیں۔قلی قطب شاہ،غواصی،وجہی،علی عادل شاہ ثانی،شاہی اور نصرتی کے کلام میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ولی دکنی اور سراج اورنگ آبادی کے کلیات بھی اس صنف کے وجود سے خالی نہیں ہیں۔یہی صورت حال شمال کے شعرا کے ساتھ بھی رہی ہے یعنی بیش تر شعرا نے کچھ نہ کچھ رباعیاں کہی ضرور ہیں۔جب شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا چرچا عام ہوا تو ابتدا سے ہی غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی لکھنے کا رواج رہا۔ابتدائی دور کے شعرا میں میرؔ،سوداؔ،دردؔ،مصحفیؔ،میر حسنؔ،قائمؔ چاند پوری نے خاصی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔مصحفیؔ نے بھی خاصی تعداد میں رباعیاں لکھی ہیں۔انشاء اللہ خاں انشاؔ نے رباعی میں جدّت پیدا کی اور ریختی کے مضامین رباعیوں میں بھی برتے گئے۔ جرأت نے کافی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔انیسؔ ودبیرؔ نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ واقعاتِ کربلا کے موضوع پر مشتمل بہت ساری رباعیاں تخلیق کی ہیں انہیں رثائی رباعی کے مخصوص نام سے پکارا گیا۔دہلی میں غالبؔ،ذوقؔ اور مومنؔ کے کلام میں بھی رباعیاں ملتی ہیں لیکن غزل اور قصیدہ کی باکمالی کی وجہ سے ان شعرا کی رباعیات کو وہ شہرت نہیں ملی جس کی وہ مستحق تھیں۔

جب نظم جدید کا دور شروع ہوا تو نظم کے ساتھ ساتھ رباعی نے بھی خوب مقبولیت حاصل کی۔حالیؔ اور اکبرؔ کی رباعیوں کے اصلاحی، سیاسی،فلسفیانہ اور ناصحانہ انداز نے ملک وقوم میں بیداری کی لہر دوڑانے میں اپنا کردار ادا کیا۔بیسویں صدی میں رباعی گوئی کی روایت کو مزید استحکام حاصل ہوا۔امجدؔ حیدرآبادی،جگت موہن لال رواںؔ تو ایسے شاعر تھے جنہوں نے صرف رباعی گوئی کی بدولت تاریخ ادب میں اپنا مقام پیدا کیا۔جوشؔ ملیح آبادی،یاس یگانہ چنگیزی اور فراقؔ گورکھ پوری نے رباعی گوئی کو نئی جہتوں اور نئے مضامین سے مالا مال کیا۔رباعی اگرچہ قدیم صنف شاعری ہے لیکن اس صنف کو صحیح معنوں میں عروج دَورِ جدید میں حاصل ہوا۔ابھی تک جو شعرا رباعی کے میدان میں طبع آزمائی کر رہے تھے خواہ میرؔ وسوداؔ ہوں،مصحفیؔ وانشاؔ ہوں یا انیسؔ ودبیرؔ؛ یہ صنف کسی کی شناخت کی وجہ نہیں بن سکی تھی۔

میرؔ غزل کے امام اور سوداؔ قصیدہ کے بادشاہ، مصحفیؔ اور انشاؔ کے میدان اَور ہیں۔ اسی طرح انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ نگاری میں جو شہرت اور کمال حاصل کیا، رباعی گوئی کی خوبی ان کی شہرت میں اضافہ نہ کرسکی۔ دورِ جدید میں جن شاعروں نے رباعی کو سنجیدگی سے برتا ہے ان میں اکبرؔ، حالیؔ، سیمابؔ، امجدؔ حیدرآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھ پوری کے ساتھ رواںؔ نے بھی نہایت گراں قدر رباعیاں کہی ہیں۔

رواںؔ کی رباعیات کا مجموعہ ''رباعیاتِ رواںؔ'' عطر چند کپور نے ادبی مرکز لاہور سے ۱۹۲۰ء میں شائع کرایا تھا، جس کا دیباچہ مشہور شاعر اصغرؔ گونڈوی نے تحریر کیا تھا۔ یہ رواںؔ کی پہلی شعری کاوش تھی۔ اس کے بعد ان کا دیوان ''روحِ رواںؔ'' کے عنوان سے ۱۹۲۸ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع ہوا تھا۔ بقولِ رواںؔ ''جو کچھ کہا تھا سب پبلک کی خدمت میں پیش کردیا ہے۔'' اس دیوان میں وہ رباعیاں بھی شامل ہیں جو رباعیاتِ رواںؔ میں شائع ہوچکی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کی غیر مطبوعہ بیاض میں بھی غزلوں اور نظموں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی غزلوں کی مجموعی تعداد ۸۹ بتائی گئی ہے، اس کے علاوہ دیوان اور بیاض کی مدد سے ان کی نظموں کی مجموعی تعداد ۴۱ اور رباعیات کی تعداد ۳۳۳ تک پہنچتی ہے۔

رواںؔ کی شعری تصانیف میں ایک مشہور تصنیف ان کی مثنوی ''نقدِ رواںؔ'' بھی ہے جس میں انہوں نے مہاتما گوتم بدھ کی سوانح کو مثنوی کے قالب میں ڈھالنے کا کام کیا ہے۔ یہ مثنوی فارسی کی مشہورِ زمانہ ''مثنوی مولوی معنوی'' کی بحر میں لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی نا تمام ہے۔ غالباً نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء میں اس مثنوی کی ابتدا ہوئی تھی اور تقریباً ڈھائی ہزار اشعار کہے بھی جاچکے تھے کہ اسی دَوران رواںؔ کا پروانۂ اجل آپہنچا اور مثنوی تکمیل سے ہم کنار نہ ہوسکی۔ یہ مثنوی ان کے بیٹے پربھان شنکر سروشؔ اُناوی نے ۱۹۵۱ء میں نامی پریس لکھنؤ سے شائع کرائی۔ اس کا دیباچہ رواںؔ کے دوست، استاد، بھائی اور لکھنوی شعر و ادب کے بڑے پارکھ نواب جعفر علی خاں اثرؔ لکھنوی نے لکھا تھا۔

رواںؔ کی نثری نگارشات میں افسانے اور ڈرامے شامل ہیں۔ ان کی نثری تصانیف میں افسانہ 'انارکلی' ڈراما 'سمجھاوَن بجھاوَن'، 'فریب عمل' ایک انگریزی ڈرامے کا اردو ترجمہ، پنڈت کرشن کانت مالویہ کی ہندی کتاب سہاگ رات کا اردو ترجمہ بہ عنوان 'بہورانی کو سیکھ یا سہاگ رات' کے علاوہ چند متفرق مضامین ملتے ہیں جو اس دور کے مشہور رسالے 'زمانہ' میں شائع ہوچکے ہیں۔ افسانہ 'انارکلی' ان کی نثر نگاری کا پہلا نمونہ ہے جو ۱۹۱۸ء میں تحریر کیا گیا تھا۔ تحقیق کا یہ ایک دل چسپ پہلو ہوسکتا ہے کہ رواںؔ نے انارکلی کے نام سے ایک افسانہ ۱۹۱۸ء میں لکھا تھا اور اسی نام سے امتیاز علی تاج نے اپنا مشہورِ زمانہ اور لازوال ڈراما انارکلی ۱۹۲۲ء میں تخلیق کیا تھا۔ کیا تاجؔ نے رواںؔ کے افسانے سے فیضان حاصل کیا ہے یا پھر وہ تمام تر ان کے تخیّل کا کرشمہ ہے! بہر حال رواںؔ کا افسانہ انارکلی ایک دل چسپ افسانہ ہے۔

رواںؔ رباعی کے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں لیکن ان کا شعری سرمایہ صرف رباعیات تک محدود نہیں ہے۔ انہوں نے غزلیں بھی کہی ہیں، نظم گوئی کے میدان میں بھی زورِ طبع دکھایا ہے، قطعہ اور مثنوی کی اصناف بھی ان کی طبیعت کی روانی سے محروم نہیں رہیں۔ شاعری کے علاوہ انہوں نے نثر کے میدان میں بھی قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے لیکن ان کی شاعری کی شہرت کے آگے نثر نگاری کا چراغ روشن نہ ہوسکا۔ تاریخ ادبِ اردو میں رواںؔ اُناوی اور امجدؔ حیدرآبادی ایسے شاعر ہیں جن کی شہرت کی ضامن صرف ان کی رباعی گوئی ہے۔

رباعیاتِ رواںؔ میں زندگی کے گونا گوں پہلوؤں کی تصویر کشی ملتی ہے۔ منظر نگاری، رندی و سرمستی، اخلاق و موعظت، فلسفہ و حکمت، سیاست اور سماجی حقوق، وطن پرستی اور انسان دوستی؛ غرض کہ ہر موضوع پر انہوں نے اپنے طرزِ خاص میں روشنی ڈالی ہے۔ رندی و سرمستی اردو

شاعری کا بہت محبوب موضوع رہا ہے۔رواںؔ کی رباعیوں میں بھی اس موضوع پر اظہارِخیال کیا گیا ہے جو کیف وسرور، جوش وخروش اور شراب معرفت سے بھرپور ہیں۔رواںؔ کی رباعیوں میں اخلاقی رباعیاں بھی الگ مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے زندگی جینے کا سلیقہ اخلاقیات کی روشنی میں سیکھا ہے۔ان کی نظر میں زندگی کی کامیابی روح کی عظمت اور کردار کی بلندی میں مضمر ہے۔

رواںؔ نے زندگی کے فلسفے کو سمجھنے اور خالق کائنات کی لازوال قدرت کے سامنے اپنی لاچاری ومجبوری کا اعتراف بھی کیا ہے۔وہ اس حقیقت کو مکمل طور پر محسوس کرتے ہیں کہ سوائے خدائے عزوجل کے اس کائنات کا منشا کوئی سمجھ نہیں سکتا ہے۔قدرتِ خداوندی کے سامنے وہ سراپا عجزوانکسار ہیں۔رواںؔ نے اپنی رباعیوں میں زندگی اور موت کی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے نیز موت کی مختلف جہتوں کا ذکر کیا ہے۔اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ رواںؔ حیات وممات کی مختلف حقیقتوں پر غوروفکر کرتے رہتے ہیں۔رواںؔ زندگی کی ناپائیداری پر مکمل یقین رکھتے ہیں۔یہ زندگانی چندروزہ ہے اس میں انسان کو لازم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے مقاصد پر نگاہ دوڑائے اور اپنی زندگی کو اصل مقصد نہ سمجھ بیٹھے۔

رواںؔ زندگی کی بے ثباتی کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ گناہ یا ثواب جو کچھ بھی کرنا ہو، انسان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جلدازجلد اس کام سے فارغ ہوجائے ورنہ یہ زندگی کب بے وفائی کرجائے گی، کسی کو معلوم نہیں۔رواںؔ اپنی رباعیات میں ہندومسلم اتحاد کے پیروکار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مذہب کی ظاہرداری کے بڑے مخالفین میں تھے۔وہ تو عبادات کے ایسے طریقوں کے بھی خلاف تھے جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انسانوں اور جانوروں کا خون بہاتا ہے۔ رواںؔ کا مسلک یہ ہے کہ وطن میں بسنے والے ہرفرد کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کے دل میں اپنے وطن عزیز کے لئے جاں نثاری کا جذبہ ہو۔سبھی افراد ایک دوسرے کے مونس وغم خوار ہوں۔اسی میں ملک وقوم کی عظمت اور شان کا راز مضمر ہے۔

رواںؔ کا خاص میدان اگرچہ فلسفہ ہے، لیکن انہوں نے عشقیہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔عشقیہ رباعیات میں رومانیت کا حسن نہ صرف دوبالا ہوگیا ہے بلکہ درد واثر، روانی اور سلاست کے ساتھ مضامین کی رنگارنگی سے یہ رباعیاں مملو نظر آتی ہیں۔رواں کی رباعیوں میں اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ بعض رباعیوں میں فکروخیال کی رنگینی بھی نظر آتی ہے۔

رواںؔ جس طرح سے عظمت انسانی کے بڑے پیروکار کے طور پر سامنے آئے ہیں، اسی طرح وہ خودشناسی اور عزتِ نفس کے جو ہر بھی انسان کی ذات کے لئے بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔وہ فکروخیال کی آزادی پر کسی قسم کا قدغن لگانے کے قائل نہیں، وہ چاہتے ہیں کہ انسان کی قوتِ پرواز آزادی کے ساتھ اپنے کمالات دکھائے۔وہ فکر کی اسیری کو غلامی کا مرادف خیال کرتے ہیں۔

گویا مختلف زاویوں سے دیکھا جائے تو رواںؔ کی رباعیاں بلند مقام پر فائز نظر آتی ہیں۔یہ بات درست ہے کہ اردو میں رباعی گوئی کی روایت ابتدا سے ہی نظر آتی ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت سے اتنی ہی قریب ہے کہ سنجیدگی سے اس صنف کی طرف توجہ بہت بعد میں یعنی دورِ جدید میں کی گئی اور ان میں رواںؔ، امجدؔ حیدرآبادی، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھ پوری کے نام نامی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔رواںؔ ایسے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ اس صنف کی طرف توجہ کی اور کامیاب رباعیاں لکھیں۔ان کی رباعیوں میں فلسفے کی آمیزش ہے۔وہ ایک خاص غوروفکر کی زائیدہ ہیں۔

رواںؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رباعی کو علاحدہ سے ایک نئی شناخت دلائی۔انہوں نے اسے غم کدے سے نکال کر رنگارنگی اور جاذبیت کا مرادف بنادیا جس میں زندگی کے تمام مظاہر کی عکاسی موجود ہے۔رواںؔ کی رباعیاں اردوادب میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں اور رواںؔ کی شہرتِ دوَام کی ضامن ان کی رباعیاں ہی ہیں۔چند موضوعات پر ان کی رباعیاں پیش خدمت ہیں:

﴿**اخلاقیات وعظمتِ انسانی**﴾ : رواںؔ کی رباعیوں میں اخلاقی رباعیاں بھی الگ مقام رکھتی ہیں۔انہوں نے زندگی جینے کا سلیقہ اخلاقیات کی روشنی میں سیکھا ہے۔ان کی نظر میں زندگی کی کامیابی روح کی عظمت اور کردار کی بلندی میں مضمر ہے۔اگر کوئی شخص ان محاسن کے حصول میں ناکام رہتا ہے تو اس کی زندگی لائق نفرین ہے۔رواںؔ کے نزدیک اخلاقیات کی روشنی میں نیک وبد کی تمیز اور شناخت کا معیار منفرد اور نرالا ہے:

سب مجھ سے اگر خوش ہوں تو مَیں شاد نہیں — معتوب جہاں میں غم سے آزاد نہیں
اچھے اچھا کہیں ، بُرے مجھ کو بُرا — جب مَیں سمجھوں کہ زیست برباد نہیں

﴿**موت کی حقیقت اور زندگی کی بے ثباتی**﴾: انسانی زندگی کی یہی مختصر سی کہانی ہے۔یہ زندگی چندروزہ ہے اس لئے اس دنیا میں بدی یا نیکی جو کچھ بھی کرنا ہو، جلدی کرو۔ورنہ ایسا نہ ہو کہ وقت نکل جائے اور تم کوئی کام نہ کرسکو۔اے انسان! ہوشیار رہو کہ یہ دنیا اور یہ زندگی دوروزہ یعنی چند دنوں کی ہے۔ایک مرتبہ جان جسم سے نکل جائے گی تو دوبارہ واپس نہیں آئے گی۔یعنی یہ زندگی انسان کو ایک بار ہی دی گئی ہے اس لئے جو کچھ کرنا ہو اسی زندگی میں اور بلا تاخیر کر لینا چاہیے۔

رُوداد یہ مختصر ہے افسانے کی — جو کچھ کر، جلدی کر، بدی یا نیکی
ہشیار کہ زندگی دو روزہ ہے رواںؔ — نکلی ہوئی جان پھر نہیں آنے کی

﴿**ہندو مسلم اتحاد و یگانگت**﴾: رواںؔ اپنی رباعیات میں ہندو مسلم اتحاد کے پیروکار کے طور پر سامنے آتے ہیں۔ان کی غزلوں اور نظموں کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ مذہب کی ظاہر داری کے بڑے مخالفین میں تھے۔وہ تو عبادات کے ایسے طریقوں کے بھی خلاف تھے جو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انسانوں اور جانوروں کا خون بہاتا ہے۔رواںؔ کے نزدیک مذہب کی اصل روح انسانی عظمت اور بنی آدم کی سرفرازی میں پوشیدہ ہے۔ہندو مسلم تنازع ان کی نگاہ میں عذابِ الٰہی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسی عذاب کی وجہ سے دنیا میں کلفتوں کی فروانی اور مسرتوں کا فقدان ہے:

اپنی عظمت کی آرزو سب کو ہے — اگلی حالت کی آرزو سب کو ہے
تفریقِ مذاہب ایک دھوکا ہے رواںؔ — کھوئی دولت کی آرزو سب کو ہے

﴿**عشقیہ رباعیاں**﴾: رواںؔ کا خاص میدان اگر چہ فلسفہ ہے لیکن انہوں نے عشقیہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔عشقیہ رباعیات میں رومانیت کا حسن نہ صرف دوبالا ہو گیا ہے بلکہ درد واثر، روانی اور سلاست کے ساتھ مضامین کی رنگارنگی سے یہ رباعیاں مملو نظر آتی ہیں۔رواںؔ کو فطرت نگاری اور منظر نگاری کے میدان سے خاص اُنس تھا۔ان کی وہ رباعیاں بلاشبہ بہت جان دار ہیں جن میں فطرت کے حسن کو موضوعِ کلام بنایا گیا ہے۔ان کی عشقیہ رباعیاں اگر چہ تعداد میں کم ہیں لیکن درد واثر اور شاعرانہ حسن سے معمور ہیں۔ان میں نادرالوجود تشبیہات کا استعمال ہوا ہے۔

جب شب میں شعاعِ نور کھو جاتی ہے
پیدا روحِ سکوت ہو جاتی ہے
فطرت اُس وقت کنمناتی ہے رواںؔ
مچھلی پانی میں جیسے کھو جاتی ہے

اے وعدۂ وصل کرکے جانے والے!
دامن میرے ہاتھ سے چھڑانے والے!
اِس طرح نہ توڑ شیشۂ خاطرِ عشق
ایسا کرتے ہیں پھر نہ آنے والے!

﴿فکروخیال کی آزادی﴾: رواںؔ کی رباعیوں میں اخلاقی اور فلسفیانہ موضوعات کے علاوہ بعض رباعیوں میں فکروخیال کی رنگینی بھی نظر آتی ہے۔رواںؔ جس طرح سے عظمتِ انسانی کے بڑے پیروکار کے طور پر سامنے آئے ہیں اسی طرح وہ خودشناسی اور عزتِ نفس کے جوہر بھی انسان کی ذات کے لئے بہت ضروری خیال کرتے ہیں۔وہ فکروخیال کی آزادی پر کسی قسم کا قدغن لگانے کے قائل نہیں وہ چاہتے ہیں کہ انسان کی قوتِ پرواز آزادی کے ساتھ اپنے کمالات دکھائے۔وہ فکر کی اسیری کو غلامی کا مرادف خیال کرتے ہیں:

آزاد ضمیر ہو، فقیری یہ ہے
دل بے پروا رہے، اَمیری یہ ہے
زنجیر نہیں ہے باعثِ قید رواںؔ
محدود رہے خیال، اَسیری یہ ہے

غرض فکری اور ادبی محاسن کے نقطۂ نظر سے رواںؔ کی رباعیاں بلند مقام پر فائز نظر آتی ہیں۔یہ بات درست ہے کہ اردو میں رباعی گوئی کی روایت ابتدا سے ہی نظر آتی ہے لیکن یہ بات بھی حقیقت سے اتنی ہی قریب ہے کہ سنجیدگی سے اس صنف کی طرف توجہ بہت بعد میں یعنی دَورِ جدید میں کی گئی اور نئے دَور میں شاعروں نے مختلف موضوعات پر اچھی رباعیاں کہی ہیں جن میں انیسؔ و دبیرؔ کے بعد رواںؔ، امجدؔ حیدر آبادی، جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھ پوری کے نام نامی بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

رواںؔ ایسے پہلے شاعر ہیں جنہوں نے پوری سنجیدگی اور انہماک کے ساتھ اس صنف کی طرف توجہ کی اور کامیاب رباعیاں لکھیں۔ان کی رباعیوں میں فلسفے کی آمیزش ہے۔وہ ایک خاص غوروفکر کی زائیدہ ہیں۔جدید مذاق اور عصری تقاضوں کو ملحوظِ نظر رکھ کر رواںؔ نے اس صنف میں اپنی شناخت قائم کی۔ان کا بنیادی رنگ فلسفیانہ ہے لیکن اس کے باوجود ان کی رباعیوں میں فلسفے کی خشکی کا دور دور تک نشان نہیں۔انہوں نے فلسفیانہ رنگ کو زورِ بیان اور نادر تشبیہات واستعارات سے اس قدر مزین کر دیا ہے کہ فلسفہ نکھار اور حسن بن گیا ہے۔

رواںؔ کی رباعیات کے بارے میں ڈاکٹر سلام سندیلوی لکھتے ہیں:

> ''رواںؔ کی رباعیات میں خیالات کی بلندی، بندش کی چستی، طرزِ ادا کی جدت، نازک تشبیہات، حسین استعارات موجود ہیں۔ان کی رباعیات میں ایک قسم کی روانی اور ترنّم موجود ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان کی رباعیات کا خاص موضوع فلسفہ ہے، لیکن فلسفہ کی آمیزش نے ان کی رباعیات کو دقیق وخشک و بے آب وگیاہ نہیں بنایا بلکہ حسن وخوبی میں اضافہ کر دیا ہے۔ان کی فلسفیانہ اور حکیمانہ رباعیات کا اندازِ بیان وہی ہے جو خیامؔ کا ہے۔''

(اردو رباعیات، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص۴۶۰)

رواںؔ سے پہلے عہد انیسؔ ودبیرؔ میں رباعی مرثیے کے ایک جز کے طور پر متعارف ہورہی تھی۔ انیسؔ ودبیرؔ اصل مرثیہ خوانی سے قبل ماحول سازی کے لئے چند ایک اخلاقی اور رثائی رباعیاں ضرور پڑھتے تھے جس کی وجہ سے اس پر مرثیہ کی چھاپ بہت گہری ہوگئی تھی۔ رواںؔ کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رباعی کو علاحدہ سے ایک نئی شناخت دلائی۔ انہوں نے اسے غم کدے سے نکال کر رنگارنگی اور جاذبیت کا مرادف بنا دیا جس میں زندگی کے تمام مظاہر کی عکاسی موجود ہے۔ رواںؔ کی رباعیاں اردو ادب میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں، اور رواںؔ کی شہرتِ دوام کی ضامن ان کی رباعیاں ہی ہیں۔

07.05 رباعیاتِ رواںؔ (اقتباس)

﴿۱﴾

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے؟ کیسی آخر یہ بزمِ نورانی ہے؟
یہ ماہِ دوہفتہ اور یہ صبحِ جمیل کس کا رخسار، کس کی پیشانی ہے؟

﴿۲﴾

جتنے انوار حسنِ صورت کے ہیں سب نغمہ نواز بزمِ قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں پردے دو چار سازِ فطرت کے ہیں

﴿۳﴾

نَو روز ہے، غرقِ بادۂ دنیا کر دے میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں مَیں شراب بھر کے اِس میں ساقی! تُو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

﴿۴﴾

توصیفِ صفت کسی کو معلوم نہیں اِس کی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیرِ دامِ نیرنگِ نمود اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

﴿۵﴾

حرص و ہوسِ حیاتِ فانی نہ گئی اِس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواںؔ مَر کر بھی اُمیدِ زندگانی نہ گئی

﴿۶﴾

کیا تم سے بتائیں، عمرِ فانی کیا تھی؟ بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیا تھی؟
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی؟

﴿۷﴾

غم شہر بہ شہر پھیلتا جاتا ہے اللہ کا قہر پھیلتا جاتا ہے
اب تک تو دلوں میں اک حرارت تھی رواںؔ اب خون میں زہر پھیلتا جاتا ہے

﴿۸﴾

اس وقت ہو اپنی قوم شایانِ نبرد　　جب ایک ہی درد سے ہوں مضطر زن ومرد
کل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو　　اور دل میں ہر اک فرد کے کل قوم کا درد

﴿۹﴾

ثروت سے ہے، نہ مال ودولت سے ہے　　عظمت دنیا کی محض ہمت سے ہے
یہ عزتِ نفس، رازِ ہستی ہے رواںؔ　　انسان، انسان حُسنِ سیرت سے ہے

﴿۱۰﴾

ہر یاس کو مدعا سمجھتے ہیں ہم　　ہر سجدے کو اک رِیا سمجھتے ہیں ہم
کیسا بت خانہ اور کعبہ کیسا؟　　ہر ذرے کو جب خدا سمجھتے ہیں ہم

07.06 رباعیاتِ رواںؔ (تشریح)

کس کے جلووں کی یہ فراوانی ہے؟　　کیسی آخر یہ بزمِ نورانی ہے؟
یہ ماہِ دوہفتہ اور یہ صبحِ جمیل　　کس کا رخسار، کس کی پیشانی ہے؟

آپ کے نصاب میں شامل پہلی رباعی میں شاعر کائنات میں موجود مختلف حسین مناظر اور نورانی مظاہر کو دیکھ کر کہتا ہے کہ آخر کائنات میں یہ کس کے جلوے پھیلے ہوئے ہیں اور یہ جو نورانی محفل سجی ہوئی ہے اس کی پشت پر کس کا وجود کام کر رہا ہے۔ چودھویں کا خوب صورت چاند اور روشن ترصبح آخر یہ سب کسی کا رخسار اور کسی کی پیشانی معلوم ہوتی ہے۔ گویا اس رباعی میں شاعر نے کائنات کے مظاہر پر غور وفکر کی دعوت دی ہے اور اس کے وسیلے سے کائنات کے خالق کے وجود کا اعتراف کرتا ہے اور اس کی عظمت کی مداحی کرتا ہے۔ اس رباعی میں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور کاری گری کو بیان کیا گیا ہے، اس طرح سے یہ رباعی حمد یہ رباعی کے ذیل میں آئے گی۔

جتنے انوار حسنِ صورت کے ہیں　　سب نغمہ نواز بزمِ قدرت کے ہیں
یہ آب و سحاب و برق و باد و باراں　　پردے دو چار سازِ فطرت کے ہیں

دوسری رباعی میں کائنات میں جتنی بھی خوب صورت چیزیں ہیں اور ان کی چمک دمک اور روشنی جس قدر بھی ہے سب اللہ کی قدرت اور اس کی بزم میں اس کی قدرت کا نغمہ گاتی ہیں۔ خواہ دریا ہوں، بادل ہوں، بجلیاں ہوں یا ہوا اور بارش؛ غرض جتنے بھی مظاہر ہیں کائنات میں سب اسی کی قدرت کے مختلف کرشمے ہیں۔ سب کے سب فطرت کے ساز کے چند پردے یعنی چند نقوش ہیں۔ اس رباعی میں بھی خدا کی حاکمیت اور اس کی قدرت کی نغمہ سرائی کی گئی ہے۔

نَو روز ہے، غرقِ بادۂ دنیا کر دے　　میرا ارمان آج پورا کر دے
پی لوں مَیں شراب بھر کے اِس میں ساقی!　　تُو کاسۂ آسماں کو سیدھا کر دے

تیسری رباعی میں شاعر خدا سے دست بدعا عرض کرتا ہے کہ آج نوروز یعنی تہوار کا دن ہے۔نوروز ایرانی سال کا پہلا دن ہے۔ایرانی اس دن کو تہوار کے طور پر پورے جوش و خروش سے مناتے ہیں۔اس تہوار کے موقع پر ساری دنیا کو شراب میں غرق کر دے، اور اے خدا! آج کے دن میری یہ تمنا اور یہ خواہش پوری کر دے۔میں یہ بھی دعا کرتا ہوں کہ اے خدا! نوروز کی آمد کے موقع پر تو آسمان کے پیالے کو سیدھا کر دے تا کہ میں اس میں شراب بھر بھر کر خوب پی لوں اور آسودہ ہو جاؤں۔آسمان گول ہے اور غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بہت بڑا پیالا ہے جس کو اُلٹ کر رکھ دیا گیا ہے۔شاعر اسی اُلٹے ہوئے پیالے کو سیدھا کرنے اور اس میں شراب پینے کی خواہش کا اظہار کر رہا ہے۔شراب کے ساغر کو اَوندھے آسمان سے تشبیہ دینا ایک عمدہ خیال ہے۔

توصیفِ صفت کسی کو معلوم نہیں اِس کی غایت کسی کو معلوم نہیں
عالم ہے اسیرِ دامِ نیرنگِ نمود اصلی حالت کسی کو معلوم نہیں

چوتھی رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ خدا کی خوبی کسی کو معلوم نہیں اور اس کائنات کی تخلیق کا مقصد بھی کوئی نہیں جانتا۔یہ دنیا اگر چہ ظاہری رنگ روپ میں تنوع اور ہزار رنگی کی اسیر ہے لیکن اس کے باوجود اس کائنات کی اصلی حقیقت کسی کو معلوم نہیں ہے۔اس رباعی میں شاعر انسان کے محدود علم و ادراک اور خدا کی لامحدود قدرت کا معترف ہے۔

حرص و ہوسِ حیاتِ فانی نہ گئی اِس دل سے ہوائے کامرانی نہ گئی
ہے سنگِ مزار پر ترا نام رواں مَر کر بھی اُمیدِ زندگانی نہ گئی

پانچویں رباعی میں شاعر مختلف خواہشات میں انسان کی دلچسپی اور محویت کو طنز کا نشانہ بناتا ہے اور کہتا ہے کہ اس فانی زندگی کی تمنّا اور لالچ ختم نہیں ہوئی اور کامیابی کی خواہش بھی انسان کے دل سے محو نہیں ہوئی۔انسان دنیا کی لذتوں کا اس قدر شیدائی اور نام و نمود کا اس قدر متوالا ہے کہ اس نے اپنی موت کے بعد سنگ مزار پر اپنا نام باقی رکھنا چاہا ہے اور اس طرح مرنے کے بعد بھی وہ زندگی کی اسیری سے اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکا۔گویا انسان سرتا سر زندگی کی لذتوں کا اسیر ہے یہ جانتے ہوئے بھی کہ ساری رونقیں عارضی اور لمحاتی ہیں۔اس رباعی میں عارضی لذتوں کے تئیں انسان کی دلچسپی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے۔

کیا تم سے بتائیں، عمرِ فانی کیا تھی؟ بچپن کیا چیز تھا، جوانی کیا تھی؟
یہ گل کی مہک تھی، وہ ہوا کا جھونکا اک موجِ فنا تھی، زندگانی کیا تھی؟

چھٹویں رباعی میں شاعر زندگی کی لمحاتی اور عارضی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ آخر کیا بتائیں کہ دنیا میں جو ہم کو حیاتِ فانی ملی تھی اس کی حقیقت کیا تھی! جو بچپن اور جوانی ہمیں ملی تھی اس کی اصلیت کیا تھی۔بس یہ سمجھ لو کہ بچپن پھول کی مہک کی طرح چند لمحوں سے زیادہ نہیں تھا اور جوانی بھی ہوا کے جھونکے کی مانند آئی اور گزر گئی۔ہماری زندگی فنا کی ایک موج تھی جو بڑی تیزی سے آئی اور چلی بھی گئی۔گویا ساری زندگی پلک جھپکتے گزر گئی اور ہم زندگی میں کوئی کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔

غم شہر بہ شہر پھیلتا جاتا ہے اللہ کا قہر پھیلتا جاتا ہے
اب تک تو دلوں میں اک حرارت تھی رواں اب خون میں زہر پھیلتا جاتا ہے

ساتویں رباعی میں شاعر گویا ہے کہ ہندو مسلم اتحاد و اتفاق کے بکھرنے کا غم شہر بہ شہر پھیلتا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا قہر ہے جو معاشرے کو مکمل اپنی گرفت میں لیتا جا رہا ہے۔ ابھی تک اس رشتے کی وجہ سے دلوں میں حرارت اور گرمی تھی، ایک اپناپن تھا لیکن رفتہ رفتہ اس رشتے میں تلخی گھلتی جا رہی ہے اور اب ہمارے خون میں فرقہ پرستی کا زہر گھلتا جا رہا ہے۔ یہ سماج اور انسانی ترقی کے لئے بہت خطرناک بات ہے۔

اس وقت ہو اپنی قوم شایانِ نبرد　　جب ایک ہی درد سے ہوں مضطر زن و مرد
کل قوم کے دل میں درد ہر فرد کا ہو　　اور دل میں ہر اک فرد کے کل قوم کا درد

آٹھویں رباعی میں شاعر کا خیال ہے کہ اس وقت ہماری قوم لڑائی اور مقابلے کے لئے موزوں ہو سکے گی جب ہمارے سماج کے تمام مرد و زن کا درد ایک ہو جائے یعنی وہ محسوسات کی اس سطح تک آ جائیں جہاں ہر کسی کا غم اور درد خود ان کا درد و غم بن جائے۔ یہ اس وقت ہو سکے گا جب قوم کے دل میں ہر فرد کا درد محسوس ہونے لگے نیز ہر فرد کے دل میں پوری قوم کا درد سما جائے۔ یعنی ایک طرف قوم بھی فرد کے غم کی نزاکت کو سمجھے اور دوسری طرف فرد بھی قوم کے اجتماعی مصائب کا احساس اپنے اندر پیدا کرلے۔ شیخ سعدیؔ کا وہ مشہور قطعہ اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے جس کا ترجمہ ہے کہ تمام انسان ایک دوسرے کے اعضا ہیں کیوں کہ سبھی کی پیدائش ایک ہی جوہر سے ہوئی ہے۔ جب ایک عضو کو درد کا احساس ہوتا ہے تو دوسرے اعضا بھی سکون اور اطمینان سے رہ نہیں پاتے ہیں۔

ثروت سے ہے، نہ مال و دولت سے ہے　　عظمت دنیا کی محض ہمت سے ہے
یہ عزتِ نفس، رازِ ہستی ہے رواںؔ　　انسان، انسان حُسنِ سیرت سے ہے

نویں رباعی میں شاعر کا خیال ہے کہ دنیا کی عظمت اور بڑائی نہ مال سے ہے نہ دولت سے ہے، بلکہ صرف اور صرف ہمت کی بدولت قوموں میں عظمت کی خوبی پیدا ہوتی ہے۔ اور عزتِ نفس اور خودداری یہی وہ جوہر ہے جو ساری ہستی کا راز ہے، اور اسی جوہر کی بدولت انسان انسان کے مرتبے پر فائز نظر آتا ہے۔

ہر یاس کو مدعا سمجھتے ہیں ہم　　ہر سجدے کو اک ریا سمجھتے ہیں ہم
کیسا بت خانہ اور کعبہ کیسا؟　　ہر ذرے کو جب خدا سمجھتے ہیں ہم

آپ کے نصاب میں شامل دسویں رباعی میں شاعر ظاہر پرست عبادت گزاروں پر طنز کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ اہل بت خانہ ہوں یا اہل حرم سب کے سب ظاہری عبادت کو حصولِ خداوندی کا ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ جب کہ ذرے ذرے میں خدا موجود ہے تو امتیازِ کفر و دیں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

07.07 جگت موہن لال رواں کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

آلودۂ معصیت ہے دامن میرا　　جل جانے کا مستحق ہے خرمن میرا
بے کار ہے شکوہ اہلِ دنیا کا رواںؔ　　بڑھ کر نہیں کوئی مجھ سے، دشمن میرا

﴿۲﴾

دنیا سَو سَو طرح سے بہلاتی ہے
سامانِ خوشی سے رُوح گھبراتی ہے
اب فکرِ فنا نے کھول دی ہیں آنکھیں
کلفت ہر بات میں نظر آتی ہے

﴿۳﴾

مخفی کوئی ، کوئی بَرملا دشمن ہے
ظالم دنیا کی ہر اَدا دشمن ہے
پچھتاتا ہوں ہٹ کے راہِ نیکی سے رواںؔ
جلاد ضمیر ، جان کا دشمن ہے

﴿۴﴾

دل مائلِ گریہ کس لئے ہوتا ہے؟
کیوں بے سبب آنسوؤں سے منہ دھوتا ہے؟
لاحل نہیں عقدۂ صعوباتِ جہاں
جب موت یقینی ہے تو کیوں روتا ہے؟

﴿۵﴾

دھوکے میں جہاں کا ہر بنی آدم ہے
عنوانِ خوشی بھی سُرخیِ ماتم ہے
یہ فیصلۂ نگاہِ عبرت ہے رواںؔ
عشرت کدۂ جہاں میں غم ہی غم ہے

﴿۶﴾

اُف باغِ اُمید کے نمو کی تاثیر
پتے پتے کے رنگ و بُو کی تاثیر
کانٹوں میں بھی دل کشی گلوں کی سی ہے
اللہ رے فریبِ آرزو کی تاثیر

﴿۷﴾

ہے چشمِ حواس کور ، آفت یہ ہے
ہم راہ رَووں کو رنجِ غربت یہ ہے
آتے ہیں کہاں سے اور جانا ہے کہاں؟
اِس کی بھی خبر نہیں ، مصیبت یہ ہے

﴿۸﴾

اللہ رے سُرورِ مذہبِ رندانہ
اللہ رے نورِ جلوۂ جانانہ
آنکھیں جو کھلیں تو ہر گنہ میں دیکھا
کعبہ اک سمت ، اک طرف بُت خانہ

﴿۹﴾

مذہب فقط اک ہوس ہے ، ایمان نہیں
بابِ ایمان کا کوئی عنوان نہیں
نیکی کرنا تو خیر مشکل ہے رواںؔ
بندہ کے لئے گنہ بھی آسان نہیں

﴿۱۰﴾

نالہ جسے کہیے ، ایک نالہ بھی نہیں
انجام یہ ہے ، دَرِ اَثر وَا بھی نہیں
ہر ذرۂ خاکِ نجد کہتا ہے رواں
وہ قیس بھی اب نہیں ، وہ لیلیٰ بھی نہیں

﴿۱۱﴾

کرتے ہوں جو دوست دل سے عزت میری   للہ کریں نہ وہ حمایت میری
کیوں ہو کے شریک، لطفِ غم کھوتے ہیں   بخشیں مِرے لئے مصیبت میری

﴿۱۲﴾

جب شب میں شعاعِ نُور کھو جاتی ہے   بیدار سی جیسے رُوح ہو جاتی ہے
فطرت اُس وقت کنمناتی ہے رواں   جس دَم دنیا تمام سو جاتی ہے

﴿۱۳﴾

ہر طرح سے درد کی فراوانی ہے   احساسِ خودی سے رنجِ رُوحانی ہے
ایسا جینا بھی کوئی جینا ہے رواں   ہم تو ہم ہیں، زبان زندانی ہے

﴿۱۴﴾

اِس سے بہتر کہ بادۂ کوثر دے   ساقی ! بس اک نگاہِ احساں کر دے
اے مطلعِ حُسن ! اے بیاضِ خورشید!   پیمانۂ دل میں نُورِ اُلفت بھر دے

﴿۱۵﴾

مایوس دلوں کا مدعا دے ساقی!   شمعِ مُردہ کو پھر جلا ساقی!
پھر دل کے عقیدے ڈگمگاتے ہیں رواں   چہرے سے نقاب پھر اُٹھا دے ساقی!

﴿۱۶﴾

یہ کیا کہ حیاتِ جاودانی کیا ہے؟   پہلے دیکھو جہانِ فانی کیا ہے؟
اِس فکر میں ہو کہ موت کیا شئے ہے رواں   یہ بھی سمجھے کہ زندگانی کیا ہے؟

﴿۱۷﴾

ہر قلب پہ بجلیاں گراتی آئی   ہر سمت اک آگ سی لگاتی آئی
ہنسے جاتے ہیں زخم ہائے کہنہ   پھر صبحِ بہار مسکراتی آئی

﴿۱۸﴾

رازِ قدرت کسی کو معلوم نہیں   اُس کی نیت کسی کو معلوم نہیں
سب محو ہیں آج کے مشاغل میں رواں   کل کی حالت کسی کو معلوم نہیں

﴿۱۹﴾

دل صرف حصولِ جام و مینا کر دے   جاں وقفِ حضورِ حُسنِ یکتا کر دے
تُو رازِ نشاط پوچھتا کیا ہے رواں   غرقِ مئے ناب دِین و دُنیا کر دے

﴿۲۰﴾

ضائع ہر طرح جستجوئے دل ہے میری ہر سانس گفتگوئے دل ہے
اصلاح کی کیا اُمید احباب سے ہو تنقیدِ حیات آرزوئے دل ہے

07.08 خلاصہ

رباعی کی صنف کی ابتدا کا دامن اگر چہ اردوشاعری کی ابتدا کے ساتھ بندھا ہوا ہے،لیکن رباعی گوئی کو صحیح معنوں میں وقار اور مقام بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوا۔ یوں تو رباعی گوئی کے بڑے اور اہم نام ہیں میرؔ وسوداؔ اور دردؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ، انیسؔ و دبیرؔ، حالیؔ، اکبرؔ اور یگانہؔ وغیرہ؛ لیکن بیسویں صدی میں جن شعرا کی شناخت محض رباعی گوئی کی بنیاد پر قائم ہوئی ان میں امجد حیدرآبادی کے علاوہ جگت موہن لال رواںؔ کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔

رباعی عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چار کے ہیں۔ یہ اردوشاعری کی ایک مقبول صنف ہے۔ اس مختصر سی نظم میں چار مصرعے ہوتے ہیں جو فکر و خیال کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہوتے ہیں۔ چاروں مصرعوں میں خیال مربوط، مسلسل اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ آخری مصرع میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔ چوں کہ آخری مصرع میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے شاعر چوتھا مصرع بہت اہتمام اور موثر انداز میں کہنے کی کوشش کرتا ہے۔ رباعی کو ترانہ اور دوبیتی بھی کہتے ہیں۔ رباعی کی شناخت یہ ہے کہ اس کے لئے مخصوص بحر ہے اور اس کے اوزان بھی مقرر ہیں۔ رباعی میں ہر قسم کے مضامین نظم کیے جاتے رہے ہیں۔ حمد ہو نعت ہو، منقبت ہو یا مسائل تصوف، مذہبیات، حکیمانہ، مفکرانہ اور اخلاقی مضامین ہوں یا پھر پند موعظت، معاملات حسن و عشق یا پھر شاعری کے دیگر مروّج مضامین غرض زندگی کا ہر پہلو اس میں بیان کیا جا سکتا ہے اور بیان ہوتا رہا ہے۔ خمریات اور مذہبیات سے تو رباعیاں بھری پڑی ہیں معشوق کے جسمانی اعضاء کا بیان جو اردو رباعی میں معدوم تھا، اسے فراق گورکھ پوری نے بھرپور انداز میں بیان کیا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ رباعی اہلِ عرب کی ایجاد ہے، لیکن اس نظریے کے ماننے والے بھی خاصی تعداد میں ہیں کہ رباعی سب سے پہلے ایران میں لکھی گئی اور عرب والوں سے اہلِ ایران سے مستعار لی۔ اردو زبان میں یہ صنف فارسی زبان کے توسط سے آئی ہے۔ اردو میں رباعی کا آغاز فارسی شاعری کے زیر اثر ہوا۔

جگت موہن لال رواںؔ کی پیدائش جنوری ۱۸۸۹ء میں بمقام اُناؤ ہوئی تھی۔ یہیں انہوں نے اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۰۷ء میں انہوں نے اوّل درجے میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا اور مزید تعلیم کے لئے لکھنؤ چلے آئے۔ یہاں کیننگ کالج میں داخلہ ملا اور ۱۹۰۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی درجہ اوّل میں پاس کرلیا۔ انہوں نے اسی کالج سے بی.اے اور ایم.اے بھی پاس کیا اور الہ آباد یونیورسٹی سے ایل.ایل.بی کی ڈگری حاصل کی۔ تعلیم کے بعد رواںؔ نے حصولِ رزق کے لئے وکالت کا پیشہ اختیار کیا۔ وہ اُناؤ میں آکر اس پیشے سے منسلک ہو گئے، اور جلد ہی ان کا شمار اناؤ کے ممتاز وکلا میں کیا جانے لگا۔ رواںؔ اگرچہ ایک کامیاب وکیل کی حیثیت سے متعارف اور مشہور ہو چکے تھے لیکن شاعری کے مقابلے میں وکالت کو وہ اپنی طبیعت اور افتادِ مزاج کے منافی خیال کرتے تھے۔ رواںؔ کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا چناں چہ جگرؔ مرادآبادی، سیمابؔ اکبرآبادی، جوشؔ ملیح آبادی، عزیزؔ لکھنوی، پنڈت آنند نرائن ملاؔ، فراقؔ گورکھ پوری، منشی دیا نرائن نگم اور نواب

جعفر علی خاں آثر لکھنوی جیسے ادیب اور شاعروں کی آمد سے اُناؤ میں ادبی محفلیں آراستہ ہوتی رہتی تھیں اور ان کے روحِ رواں جگت موہن لال رواں ہوا کرتے تھے۔ رواں کا انتقال ۱۹۳۴ء میں ہوا۔ جگت موہن لال رواں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے رباعی کو علاحدہ سے ایک نئی شناخت دلائی۔ انہوں نے اسے غم کدے سے نکال کر رنگارنگی اور جاذبیت کا مرادف بنا دیا جس میں زندگی کے تمام مظاہر کی عکاسی موجود ہے۔ رواں کی رباعیاں اردو ادب میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں، اور رواں کی شہرتِ دوام کی ضامن ان کی رباعیاں ہی ہیں۔

07.09 فرہنگ

ارتقا پذیر	: لگاتار آگے بڑھنے والا	صیقل گری	: آلہ کی مدد سے دھار تیز کرنا، یہاں مراد صلاحیت کو چمکانا ہے
استحکام	: مضبوطی، پختگی		
بیاض	: جس کتاب میں شعرا اپنے اشعار لکھتے ہیں،	عزتِ نفس	: اپنی عزت آپ کرنے کا احساس، سیلف رسپکٹ
	: یادداشت کی ڈائری	عشقِ حقیقی	: وہ عشق جو خدائے تعالیٰ سے کیا جائے، محبت الٰہی
جدت	: نیاپن، تازگی	عشقِ مجازی	: دنیوی انسانوں کا عشق، محبتِ اہلِ دنیا
خمریات	: ایسے اشعار یا شاعری جس میں شراب اور اس کے لوازمات کا ذکر ہو	عطیۂ خداوندی	: خدا کی دین
		قاطعِ لذات	: لذتوں کو ختم کر دینے والی
رندی	: مستی، بے خودی	قدغن	: روک، ممانعت
ریختی	: وہ نظم جو عورتوں کی بولی میں عورتوں کی طرف سے کہی جائے	مملو	: لبریز، بھرا ہوا
		ودیعت	: سپرد کرنا
سبک دوش	: جو فارغ کر دیا گیا ہو، آزاد	یگانگت	: قرابت، اتحاد

07.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر ۱ رباعی کے فن پر اجمالاً گفتگو کیجیے۔

سوال نمبر ۲ رباعی اور قطعے کا فرق واضح کیجیے۔

سوال نمبر ۳ جگت موہن لال رواں کی تصانیف کا جائزہ لیجیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر ۱ جگت موہن لال رواں کے حالاتِ زندگی تحریر کیجیے۔

سوال نمبر ۲ اردو رباعی گوئی میں رواں کی مجموعی خدمات کا جائزہ لیجیے۔

سوال نمبر ۳ رباعی کی تعریف بیان کیجیے اور اس کی ابتدا پر ایک مضمون لکھیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱ : رباعی کا معنٰی کیا ہے؟

(الف) ۴؍چار　(ب) ۸؍آٹھ　(ج) ۶؍چھ　(د) ۱۰؍دس

سوال نمبر۲ : رباعی کس بحر میں کہی جاتی ہے؟

(الف) بحرِ رمل میں　(ب) بحرِ ہزج میں　(ج) بحرِ رجز میں　(د) بحرِ کامل میں

سوال نمبر۳ : بحرِ ہزج کا وزن کیا ہے؟

(الف) فاعلن۴؍بار　(ب) فعولن۴؍بار　(ج) مفاعیلن۴؍بار　(د) فاعلاتن۴؍بار

سوال نمبر۴ : جگت موہن لال رواںؔ نے کس قسم کی رباعیاں کہی ہیں؟

(الف) تصوفانہ　(ب) اخلاقی　(ج) ناصحانہ　(د) فلسفیانہ

سوال نمبر۵ : جگت موہن لال رواںؔ کب پیدا ہوئے؟

(الف) ۱۸۸۹ء میں　(ب) ۱۸۸۵ء میں　(ج) ۱۸۸۴ء میں　(د) ۱۸۸۸ء میں

سوال نمبر۶ : جگت موہن لال رواںؔ کب فوت ہوئے؟

(الف) ۱۹۳۵ء　(ب) ۱۹۳۴ء　(ج) ۱۹۳۶ء　(د) ۱۹۳۳ء

سوال نمبر۷ : جگت موہن لال رواںؔ کتنے برس کی عمر میں فوت ہوئے؟

(الف) ۶۵؍برس کی عمر میں　(ب) ۵۵؍برس کی عمر میں　(ج) ۴۵؍برس کی عمر میں　(د) ۷۵؍برس کی عمر میں

سوال نمبر۸ : جگت موہن لال رواںؔ نے کتنی غزلیں کہی ہیں؟

(الف) ۷۹؍غزلیں　(ب) ۹۹؍غزلیں　(ج) ۶۹؍غزلیں　(د) ۸۹؍غزلیں

سوال نمبر۹ : جگت موہن لال رواںؔ نے کتنی نظمیں کہی ہیں؟

(الف) ۴۱؍نظمیں　(ب) ۴۲؍نظمیں　(ج) ۴۳؍نظمیں　(د) ۴۴؍نظمیں

سوال نمبر۱۰ : مثنوی ''نقدِ رواںؔ'' میں کتنے اشعار ہیں؟

(الف) ۷۸۶　(ب) ۲۵۰۰　(ج) ۱۹۹۲　(د) ۱۷۰۰

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ۴؍چار
جواب نمبر۲ : (ب) بحرِ ہزج میں
جواب نمبر۳ : (ج) مفاعیلن۴؍بار
جواب نمبر۴ : (د) فلسفیانہ
جواب نمبر۵ : (الف) ۱۸۸۹ء میں
جواب نمبر۶ : (ب) ۱۹۳۴ء
جواب نمبر۷ : (ج) ۴۵؍برس کی عمر میں
جواب نمبر۸ : (د) ۸۹؍غزلیں
جواب نمبر۹ : (الف) ۴۱؍نظمیں
جواب نمبر۱۰ : (ب) ۲۵۰۰

07.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ　از　سلام سندیلوی

۲۔ اردو رباعیات　از　سلام سندیلوی

۳۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ　از　احتشام حسین

۴۔ اصنافِ ادبِ اردو　از　قمر رئیس، خلیق انجم

۵۔ تاریخ ادبِ اردو　از　نورالحسن نقوی

۶۔ تذکرے اور تبصرے　از　جلیل قدوائی

۷۔ جگت موہن لال رواں (مونوگراف)　از　سلیمان اطہر جاوید

۸۔ جگت موہن لال رواں: حیات و خدمات　از　ظفر عمر قدوائی

✲

اکائی 08 رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھ پوری (بحیثیت رباعی گو)

ساخت

08.01 : اغراض ومقاصد

08.02 : تمہید

08.03 : رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھ پوری کے حالاتِ زندگی

08.04 : رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھ پوربحیثیتِ رباعی گو

08.05 : رباعیاتِ فراؔق (اقتباس)

08.06 : رباعیاتِ فراؔق (تشریح)

08.07 : رگھوپتی سہائے فراؔق گورکھ پوری کی منتخب دیگر رباعیاں

08.08 : خلاصہ

08.09 : فرہنگ

08.10 : سوالات

08.11 : حوالہ جاتی کتب

08.01 اغراض ومقاصد

اس اکائی میں اردو کے مشہور شاعر فراؔق گورکھ پوری کی رباعی گوئی کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی۔ رباعی کی صنف کی ابتدا کا دامن اگر چہ اردو شاعری کی ابتدا کے ساتھ بندھا ہوا ہے، یعنی تقریباً تمام اہم شعرا نے اس صنف میں طبع آزمائی کی لیکن رباعی گوئی کو صحیح معنوں میں وقار اور مقام بیسویں صدی کے اوائل میں حاصل ہوا۔ یوں تو رباعی گوئی کے بڑے اور اہم نام وہی ہیں جو اردو غزل اور دیگر اصناف میں بھی اپنی انفرادیت تسلیم کرا چکے ہیں یعنی میرؔ و سوداؔ، دردؔ و مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ، انیسؔ و دبیرؔ، حالیؔ و اکبرؔ اور یگانہؔ وغیرہ لیکن بیسویں صدی میں جن شعرا نے رباعی گوئی میں امتیازی مقام حاصل کیا۔ ان میں امجدؔ حیدر آبادی، جگت موہن لال رواںؔ کے ساتھ ساتھ جوشؔ ملیح آبادی اور فراؔق گورکھ پوری کا نام بہت احترام سے لیا جاتا ہے۔ فراؔق کی رباعی گوئی کی امتیازی خصوصیات کیا ہیں اس اکائی کے تحت اس پر مثالوں کی روشنی میں گفتگو ہوگی نیز سرسری طور سے رباعی کے فن، ابتدا اور روایت پر بھی روشنی ڈالی جائے گی تاکہ فراؔق کی انفرادیت واضح اور روشن ہو سکے۔

08.02 تمہید

اردو کے جن چند اہم شعرا کے کارناموں اور خدمات کی بدولت رباعی گوئی کی آبرو باقی ہے ان میں جوشؔ اور فراؔق گورکھ پوری کے نام بہت اہم ہیں۔ رباعی گوئی کی مختصر سے مختصر فہرست بھی فراؔق کے نام کے بغیر ادھوری اور نا تمام رہے گی۔

فراقؔ بیسویں صدی کی اردو شاعری کے ایک اہم ستون ہیں۔ جدید غزل کے احیا میں ان کے کارناموں سے صرفِ نظر نہیں کر سکتے۔ انہوں نے خاصی تعداد میں نظمیں بھی لکھی ہیں۔ تنقید کے میدان میں بھی ان کے کارنامے عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''من آنم'' خطوط کا مجموعہ ہے جس میں فراقؔ کے شب و روز کے بارے میں گراں قدر معلومات موجود ہیں۔ رباعی گوئی کے میدان میں ان کا کارنامہ بہت زبردست ہے۔ ''روپ'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے اور ان رباعیوں کی بدولت انہوں نے رباعی گوئی کی روایت میں ایک شان دار عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ فراقؔ سے پہلے عام طور سے رباعی گوئی کے بنیادی موضوعات حکمت، فلسفہ، اخلاقیات، حمد و نعت و منقبت، عشق حقیقی اور تصوف وغیرہ کے ارد گرد گردش کرتے رہتے تھے لیکن فراقؔ نے اس میں ہندوستانی عناصر، ہندوستانی تلمیحات و اساطیر، نیز ہندوستانی گھرانوں کی فضا کو شامل کر کے اسے ہماری زندگی سے بہت قریب کر دیا۔ فراقؔ نے اس میں ایسا حُسن شامل کر دیا ہے جو ہماری جمالیات کا لازمی حصہ بن گیا ہے نیز ہماری زندگی کو خوب صورت احساس سے ہم کنار کرنے میں اپنا کردار ادا کر رہا ہے۔

08.03 رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری کے حالاتِ زندگی

رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری ۲۸ راگست ۱۸۹۶ء گورکھ پور کے بانس گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شری گورکھ پرساد سہائے نام وَر وکیل تو تھے ہی ایک عمدہ اور کلاسیکی رنگ کے ایک خوش فکر شاعر تھے۔ عبرتؔ تخلص کرتے تھے۔ غزلیں اور نظمیں بھی کہیں۔ عبرتؔ کا یہ شعر بہت مشہور ہوا:

زمانے کے ہاتھوں سے چارہ نہیں ہے زمانہ ''ہمارا تمہارا'' نہیں ہے

لیکن ان کی اصل شہرت ایک مثنوی ''حُسنِ فطرت'' بہت مشہور ہوئی تھی۔ یہ ایک منظوم تمثیلی قصہ ہے جو اپنے زمانے میں بہت مشہور ہوا۔ فراقؔ کے گھر میں علمی و ادبی ماحول تھا۔ والدِ گرامی شہر کے مشہور کے وکیلوں میں سے تھے۔ گورکھ پور شہر میں لکشمی بھون نام کی کوٹھی تھی جوان کے دادا کے نام سے منسوب تھی۔ ہر طرح کے آسائش تھی لیکن فراقؔ عام بچوں سے مختلف تھے۔ انہیں کھیل کود سے زیادہ دل چسپی نہیں تھی۔ ایک خط میں وہ خود لکھتے ہیں:

''بچپن میں ہی میں نے اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو مختلف پایا۔ مثلاً ان میں سب سے زیادہ جذباتی محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدّت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں مجھے حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظرِ فطرت سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ انہیں میں کھو جاتا۔ میرے بچپن کی دوستیاں شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھلونوں سے اتنا شدید لگاؤ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجّب کرتے تھے۔''

(فراق کا خط محمد طفیل کے نام)

جذبات و احساسات کی سطح پر بچپن سے ہی فراق عجیب وغریب ثابت ہوئے۔ وہ حُسن پرست تھے اپنے ایک بدصورت ماموں کو مشکل سے سلام کر پاتے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرہ والدہ کا کہنا تھا کہ میں دو تین سال کی عمر ہی سے کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اُڑی تھی اور کبھی مجھے اس کے لئے چڑایا بھی جاتا تھا۔'' (غبارِ خاطر'، ماہ نامہ آج کل دسمبر ۱۹۷۰ء)

اس عہد میں ایک خوش حال کایستھ گھرانے کی جو تہذیب و معاشرت ہوا کرتی تھی وہ فراق کے گھر میں تھی۔ فارسی پڑھی پڑھائی جاتی تھی۔ فراق نے یہ سب پڑھا ساتھ ہی رامائین اور لوک گیتوں کا بھی مطالعہ کیا۔ لوک گیتوں کی دھن فراق کو بہت متاثر کرتی تھی۔ پندرہ سولہ برس کی عمر تک ان میں شعر و شاعری اچھا خاصا ذوق شوق پیدا ہو چلا تھا۔ آٹھویں یا نویں کلاس میں ہی تھے کہ فراق کے پھوپھی زاد بھائی راج کشور لال سحر فراق کے دوست بن گئے۔ ان کی صحبت میں فراق نے گلزارِ نسیم کا مطالعہ کیا۔ امیر مینائی اور دیگر شعرا کے بہت سے اشعار فراق کو حفظ ہو گئے۔ فراق کے چچا ہندی کے اچھے ادیب تھے، والد بھی شاعر، غرض کہ فراق کا بچپن اور جوانی کا زمانہ خالص شعر و شاعری میں گزرا۔ اس زمانے میں ہندو اور بالخصوص کائستھ گھرانے میں جلدی شادی کر دی جاتی تھی۔ چنانچہ فراقؔ کی شادی ۱۹۱۴ء میں کشوری دیوی سے کر دی گئی اس خیال سے کہ ان کی زندگی کی گاڑی راستے پہ آ جائے گی لیکن یہ شادی ناکام رہی۔ فراق جیسے حساس اور جمال پرست انسان کی زندگی میں یہ شادی ایک بڑا حادثہ بن گئی۔ ان کی بیوی معمولی شکل وصورت کی تھیں اور فراق کے بیان کے مطابق دھوکہ دے کر ان کی شادی کر دی گئی۔ اس سے ان کو بڑا صدمہ پہنچا۔

خود اپنی بیوی کے بارے میں فراق لکھتے ہیں:

> ''اٹھارہ برس کی عمر میں شادی کر دی گئی۔ میری بیوی کی شکل وہی تھی بالکل اس سے بھی گئی گزری جوان لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں انکار کر دیا کرتا تھا۔ میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا تھا۔''

فراق کی زندگی کا دوسرا بڑا حادثہ ان کے والد کا انتقال تھا۔ ابھی وہ بی.اے میں تھے کہ ان کے والد شدید بیمار ہوئے۔ آب و ہوا کی تبدیلی کے لئے ان کو دہرہ دون لے جانا پڑا۔ ۱۷؍جون ۱۹۱۸ء کو ان کو آخری ہچکی آئی اور روح پرواز کر گئی۔ والد کی انتقال سے متاثر ہو کے فراق نے ایک رباعی کہی جو کہ ذیل میں درج کی گئی ہے:

پردہ، فطرت کے رُوئے زیبا سے اُٹھا	غفلت کا حجاب کوہ و صحرا سے اُٹھا
پچھلے کو فراقؔ کون دنیا سے اُٹھا؟	پَو پھٹنے کا آج سہانا ہے سماں

ابتدائی تعلیم گورکھ پور میں مکمل کرنے کے بعد وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے الہٰ آباد آ گئے۔ ایف.اے کا امتحان ۱۹۱۵ء میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پاس کیا۔ اسی درمیان میں فراق کو سنگرہنی کا مرض لاحق ہو گیا اور نیند آنکھوں سے غائب ہو گئی۔ الہٰ آباد یونیورسٹی سے ۱۹۱۸ء میں بی.اے کی ڈگری لی۔ والد کی موت کی وجہ سے گھر کی مالی حالات خراب ہوتے گئے نوبت یہاں تک پہنچی کہ فراق کو آبائی مکان لکشمی بھون کو بیچنا پڑا۔ اسی سال ۱۹۱۸ء میں فراق نے سول سروس کا امتحان پاس کر لیا لیکن ملازمت نہیں کی اور جواہر لال نہرو کے ساتھ قومی تحریک میں شامل ہو گئے۔ گورکھ پور اور الہٰ آباد کے متعدد جلسوں میں ان کی تقریریں سن کر ان کا ذہن بدل گیا اور وہ سیاست کی طرف آ گئے جس کا اس وقت واحد مقصد حصولِ آزادی تھا۔ فراق باقاعدہ کانگریس پارٹی میں شریک ہو گئے۔ سال بھر جیل میں رہے۔

رہائی کے بعد کانگریس کمیٹی کے انڈر سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ بعد میں فراق نے ۱۹۳۰ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی میں ایم.اے کرنے کے بعد الہٰ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی میں استاد مقرر ہوئے۔ جس سے فراق کی زندگی کو ایک راہ مل گئی وہ راہ

فراق کے بہت مناسب تھی۔اس ملازمت سے آپ کو یک گونہ سکون ضرور ملا۔جیل کی زندگی کے شب وروز،عملی سیاست سے وابستگی،گاندھی، نہرو،حسرت،محمد علی اور بعض دوسرے سیاسی اکابر کی قربت ان سب سے بالعموم اور نہرو کی علمی وادبی شخصیت نے بالخصوص ان کے شعور کی آنکھیں کھول دیں۔حیات وکائنات کے افہام وتفہیم کے عالمی معیاران کی دَست رَس میں آئے جس سے ان کی شاعرانہ۔دانش وَرانہ شخصیت کو مستحکم اور تہدار تو کیا۔ان کے تخیل ووجدان کو ایک نئی بصیرت وآگہی سے مالا مال کیا۔انہوں نے شاعری کو سیاسی اور عالمی پس منظر اور حوالوں سے سمجھنا اور پیش کرنا شروع کردیا۔اس طرح فراق ایک عظیم دانش وَری کی راہ پر چل پڑے۔اگر وہ معمولی انسان یا دنیادار ہوتے تو سیاست سے ہر طرح کے فائدے اٹھاتے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور جلد ہی دامن جھٹک کر الگ ہوگئے۔مجنوں گورکھ پوری نے لکھا ہے:

> ''رگھوپتی شاعر کے علاوہ بہت کچھ ہو سکتے تھے اور بہت کچھ ہیں۔اگر وہ چاہتے تو اپنی تمام تر شرافتوں اور صداقتوں کو قربان کر کے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔انہوں نے ظاہری جاہ وثروت اور عملی مفاد کی اتنی پرواہ نہیں کی جتنی دنیاداروں کے درمیان اپنی عزت اور ساکھ قائم کرنے کے لئے کرنا چاہیے۔''

۱۹۴۷ء میں دہلی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے عمدہ تقریر بھی کی۔اسی کے آس پاس فرقہ پرستی کے خلاف ان کی ایک طویل تقریر مقالہ کی شکل میں ''ہمارا سب سے بڑا دشمن'' شائع ہوئی۔۱۹۵۴ء میں بستی کی کانفرنس میں تقریر کی۔۱۹۵۶ء میں ایشیائی ادیبوں کی کانفرنس میں یادگار تقریر کے علاوہ ۱۹۷۰ء اور ۱۹۷۳ء کے جلسوں میں تقاریر کیں۔''من آنم'' کے خطوط میں انہوں نے حیات وکائنات کا فلسفہ نچوڑ کر رکھ دیا۔فراق ۳۱؍دسمبر ۱۹۵۸ء کو ملازمت سے ریٹائر ہوگئے۔ریٹائرمنٹ کے بعد تقریباً بائیس تیئس سال زندہ رہے اور ایک طویل علالت کے بعد ۱۹۸۲ء میں فراق کا انتقال دہلی میں ہوا۔

فراقؔ کے شعری مجموعوں میں شعلۂ ساز،غزلستان،شعرستان،روحِ کائنات،شبنمستان،پچھلی رات،روپ،گلِ نغمہ،دھرتی کی کروٹ اور تنقیدی تحریروں میں اندازے،اردو کی عشقیہ شاعری اور مکاتیب کا مجموعہ 'من آنم' قابل ذکر ہیں۔

08.04 رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھ پوری حیثیتِ رباعی گو

فراقؔ نے اپنا شعری سفر ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ شروع کیا تھا۔ابتدائی دَور میں امیر مینائی کے شاگرد وسیمؔ خیرآبادی سے اصلاح لیتے تھے لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کا سراغ پالیا اور خود اپنا رنگِ سخن ایجاد کیا۔فراقؔ کے ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ روپ کی رباعیوں کا اصل محرک جوشؔ ملیح آبادی سے دہلی میں ان کی ادیبانہ نوک جھونک تھی۔فراقؔ لکھتے ہیں:

> ''بعد کو دلی کے اس قیام میں مجھ سے تم سے اَن بن ہوگئی تھی اور آپس میں تیز تیز باتیں بھی ہوگئی تھیں جس کی تکلیف ہم دونوں کو بہت دنوں تک رہی شاید اب تک ہے۔تم پونا چلے گئے اور میں الٰہ آباد چلا آیا۔اب اسے وقت کی ستم ظریفی کہوگے یا فالِ نیک بتاؤگے کہ الٰہ آباد آکر جو پہلی چیز مجھ سے ہوئی وہ ایک رباعی ہوئی، جس میں میں نے تمھیں مخاطب کیا اور دلی میں ہوجانے والی اس اَن بن کی طرف اشارہ کیا۔رباعی یہ تھی:

معصوم خلوصِ باطنی کچھ بھی نہیں   وہ قرب، وہ قدرِ باہمی کچھ بھی نہیں
اک رات کی وہ جھڑپ،وہ جھک جھک سب کچھ   اور آٹھ برس کی دوستی کچھ بھی نہیں

یہ رباعی روپ کی ان رباعیوں کا شگون تھی۔ اسے کہنے کے دو ہفتوں کے اندر اندازاً سو رباعیاں ہو گئیں جو دو مہینوں میں بڑھ کر ساڑھے تین سو کی تعداد تک پہنچ گئیں۔''

فراقؔ جدید اردو غزل کے بڑے شاعروں میں تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے رباعیوں میں بھی امتیاز حاصل کیا۔ ''روپ'' کے نام سے رباعیوں کا ایک مجموعہ بے حد مشہور ہوا تھا، یہ ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ بعض نقادوں نے فراق کی رباعیوں کو اردو ادب میں اضافہ سے تعبیر کیا ہے۔ اس بات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بات بجائے خود درست ہے کہ ان رباعیوں کی مدد سے فراقؔ نے سنسکرت کے شرنگار رَس اور ہندی کی ریتی کال کی شاعری کی بنیادی خصوصیات کو اردو زبان وادب کے سرمایے کا حصہ بنا دیا ہے۔ اس کے علاوہ گھریلو محبت کے ایسی تصویریں اور جھلکیاں اس سے پہلے اردو شاعری میں نہیں تھیں۔

''روپ'' کی رباعیوں میں ہندوستانی عورت کے جسم و جمال کی تمام دل کشی کے ساتھ اور ہندوستانی کنبہ اپنی تمام تر لطافتوں کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ عورت کا کنوار پن، بیوی کا سگھڑاپا، ماں کا دُلار پیار وغیرہ ان رباعیوں میں طرح طرح سے بیان ہوئے ہیں۔ ان میں ممتا کا جذبہ ہے اور جسم و جان کی رنگینیاں بھی آباد ہیں۔

روپ کی رباعیوں میں ہندوستان بالخصوص شمالی ہند کی گھریلو زندگی کے حسن اور سلیقے کی عکاسی بڑی فن کاری سے کی گئی ہے۔ فراقؔ جس گھریلو زندگی سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے وہ ہندی گھرانوں کی فضا تھی ان کی بیش تر رباعیاں ہندو کنبے کے رہن سہن، ادب وآداب اور طرزِ معاشرت کی عکاسی کرتی ہیں لیکن اس میں ہندی اور ایرانی ثقافت کا خوش نما امتزاج پیدا ہو گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ماں اپنے بچے کو کس کس انداز سے پیار کر رہی ہے اور اس کی محبت میں کس طرح سے خود بھی تکلیفیں اُٹھا کر لطف اندوز ہوتی ہے اس کا بیان انہوں نے خوب صورت انداز میں یوں کیا ہے:

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

ایک کنواری لڑکی کے رنگ روپ کی عکاسی اس طرح کرتے ہیں:

دوشیزہ، فضا میں لہلہایا ہوا روپ آئینۂ صبح میں جھلکتا ہوا روپ
یہ نرم نکھار ، یہ سج دھج ، یہ سگندھ رَس میں ہے کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

ہندوستانی معاشرہ میں رفیقۂ حیاتِ تقدیس اور محبت کا بڑا انوکھا روپ ہے۔ ایک وفا شعار بیوی کی حیثیت اور اس کا کردار شوہر کی نظروں میں کتنا پاکیزہ اور اہم ہے اس کا جواب فراقؔ نے اس رباعی میں دے دیا ہے:

تُو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے دُکھ درد زمانے کا مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں سکھ شانت کی گویا تُو ہری کھیتی ہے

ان رباعیوں میں پہلی بار فراق نے ہندو گھرانوں کی فضا کی عکاسی کی ہے۔ اس میں ان کی کوشش جسمانیات کی عرفانیات نظم کرنے کی ہے۔ جسم اور مادہ کے تقدس اور اس سے پیدا ہونے والی پاکیزگی ان رباعیوں کا موضوع ہے۔ یہاں آنگن میں تلسی کو پانی دینے والی

سہاگنوں کی تصویریں بھی ہیں اور گج گامنی ایسی چال والی کامنیاں بھی۔ان رباعیوں کی محض یہ اہمیت نہیں ہے کہ ان میں ہندو گھرانوں کی تصویریں ہیں بلکہ اس کلچر کی پرچھائیاں بھی ہیں جو قدیم ہندوستان کے طرزِ حیات میں جلوہ گر ہوا تھا اور جس نے مصوری، بت گری، مجسمہ سازی، سنگیت اور ادب سبھی فنونِ لطیفہ کو ایک اکائی میں پرو دیا تھا۔

﴿رباعیاتِ فراقؔ کا موضوع﴾: روپ کی رباعیوں کو موضوع کے اعتبار سے دو زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔وہ رباعیاں جن میں محبوب کے حسن دل آرا کی تصویریں پیش کی گئی ہیں۔دوسری قسم کی رباعیاں وہ ہیں جن میں ہندوستانی زندگی اور ہندوستانی طرزِ معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔پنگھٹ پر لڑکیوں کی گگریاں، معصوم بچیوں کا کھیتوں میں دوڑنا، اشنان کے بعد لباس کو اُلگنی پر پھیلانا، بیٹی کے سسرال جانے کا منظر، بابل کے گیتوں کا سوز وساز اور چوکے کی سہانی آگ میں مکھڑے کا دَمکنا وغیرہ ہندوستانی معاشرت کے ایسے خاکے ہیں جن میں فراق کے تخیل ان کے رچے ہوئے جمالیاتی شعور اور ان کے تیکھے طرزِ ابلاغ نے جان ڈال دی ہے۔

آنکھوں میں سرشک، جگمگاتا مکھڑا وہ جشنِ رخصتی ، سہانا تڑکا
جھرمٹ میں سہیلیوں کے، اُٹھتے ہیں قدم وہ گھر کی عورتوں کا بابل گانا

﴿ہندوستانی عورت کا بیان﴾: فراقؔ کی رباعیات کا مرکزی موضوع عورت ہے۔اسی کے اردگرد کی بھرپور زندگی کو فراقؔ نے اپنی رباعیات کے مرکز میں رکھا ہے مگر اس کے پس منظر میں ہندوستانی تہذیب ومعاشرت کی مصوّری فراقؔ نے اس انداز سے کی ہے کہ ہر تصویر بولنے لگی ہے اور احساسِ جمال کا ہر گوشہ منور ہو جاتا ہے۔اردو کے سارے نقادوں نے بیک زبان روپ کی رباعیات کو اردو شاعری میں اضافہ قرار دیا ہے کیوں کہ اردو شاعری اب تک اس خالص ہندوستانی رنگ وآہنگ سے محروم تھی لیکن اس سلسلے میں مجاور حسین رضوی کی رائے مختلف ہے، وہ فرماتے ہیں:

> ''رباعیات میں ارضیت کے تصوّر پر ان کے بارے میں بہت ہی چمکتے ہوئے روشن فقرے لکھے گئے مگر فراق صاحب رباعیات کے سلسلے میں مجتہد نہیں تھے، مقلد تھے۔دکنی میں یہ روایت بہت پہلے سے موجود تھی۔یہ دوسری بات ہے کہ ہمارے بہت سارے جید نقادوں کو دکنی نہیں آتی تھی یا انہوں نے وہ رباعیات نہیں پڑھی تھیں اور اس لئے فراق کو چند رباعیات کے سلسلے میں مجتہد، امام پیغمبر سب ہی کچھ بنا ڈالا۔''

اس بات سے انکار کی گنجائش نہیں لیکن فراقؔ کا کارنامہ اتنا ضرور ہے کہ انہوں نے اردو رباعی کی ایک گم شدہ کڑی کو نہ صرف تلاش کر لیا بلکہ اس کو نئے سرے سے ہماری جمالیات کا حصہ بنا دیا۔فراقؔ کا کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے شمالی ہندوستان میں بودوباش کرنے والے ہندو گھرانوں کی معاشرت اور گھریلو فضا کی جان دار عکاسی کی ہے۔ان معنوں میں روپ کی رباعیاں بلاشبہ اردو میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔فراقؔ نے اپنی رباعیوں میں عورت کی سراپا نگاری میں کن جذبات اور کن مقاصد کو مشعل راہ بنایا یہ اہم نہیں ہے۔اہم بات یہ ہے کہ ان میں عورت کی ایک تصویر وہ ہے جو ہمارے شریفانہ جذبات کو مہمیز کرتی ہے۔عورت کے معاشرتی منصب اس کے سماجی وقار اور اس کی تہذیبی فضیلت کے مختلف پہلو ہماری نگاہوں کے سامنے اُبھر آتے ہیں۔وہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے سامنے آتی ہے۔

﴿سراپا نگاری اور حسن وعشق کا بیان﴾: روپ کی تمام رباعیاں جمالیاتی ذوق کی تسکین کا وافر خزانہ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں۔ فراقؔ نے روپ کی رباعیات میں سراپا و پیکر نگاری کے ضمن میں کوئی حصہ اچھوتا نہیں چھوڑا ہے۔ قد، چال، بدن، رنگ، انگڑائی، ماتھا، آنکھیں، نگاہ، ابرو، زلفیں، گیسو، آواز، ہنسی، چہرہ، تل، کانوں کی لو، ناک، بازو، سینہ، بغل، شانہ، ناف، ران، پنڈلی، ٹخنے، تلوے اور حمام میں عریانی تن کا ذکر کرنے میں بھی وہ چوکے نہیں ہیں لیکن لہجہ کی معصومیت، بیان کی صفائی، تخیلات کی پاکیزگی اور الفاظ کی تہذیب نے عریانی میں بھی طہارت و تقدیس کو قائم رکھا ہے۔ ان رباعیات کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ صرف چند کو چھوڑ کر اس کی ہر رباعی ایک نادر تشبیہ کا نمونہ بھی ہے، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

ساغر کفِ دست میں، صراحی بہ بغل کاندھے پر گیسوؤں کے کالے بادل
یہ مدھ بھری آنکھ، یہ نگاہیں چنچل ہے پیکرِ نازنین کہ حافظؔ کی غزل

☆

چہرہ دیکھے تو رات غم کی کٹ جائے سینہ دیکھے تو اُمنڈا ساگر ہٹ جائے
سانچے میں ڈھلا ہوا یہ شانہ، یہ بغل جیسے گلِ تازہ کھلتے کھلتے پھٹ جائے

فراق جب محبوب کے جسم کے مختلف اعضا اور اس کی مختلف اداؤں کی جانب متوجہ ہوتے ہیں پھر دیکھیے فراقؔ کی گل افشانی گفتار ان کے تراشے ہوئے صنم بولنے لگتے ہیں ان میں زندگی کی حرکت پیدا ہو جاتی ہے اور وہ جمالیاتی حس کو متحرک کر دیتے ہیں۔

ہے قوسِ قزح کہ تھرتھراتے بازو رشکِ فردوس، لہلہاتے پہلو
رقصاں شعلہ ہے، لچکی لچکی سی کمر کندل پہ کمر ہے یا دمکتا پیڑو

ان رباعیوں میں فراق یونان وروما کے صنم تراشوں کی طرح مجسمہ تراشتے ہیں اور ان اصنام میں اس طرح کھو جاتے ہیں کہ ان کو اپنی اقدار و روایات تو در کنار خود اپنا پاس و لحاظ نہیں رہ جاتا۔ وہ خاص الخاص رومانی شاعر کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں جس کو روح سے زیادہ جسم سے، اعلیٰ وجدان اور روحانی سرور سے زیادہ جسمانی لمس و لذت سے دلچسپی نظر آتی ہے۔

﴿ہندوستانی فضا اور رسم و رواج﴾: فراقؔ کے روپ میں جھانک کر دیکھیے تو یہاں بھی ہندوستان کی وہی جانی پہچانی فضا ہے۔ وہی ہندوستان کی سوندھی مٹی کی باس، یہاں کی ٹھنڈک، یہاں کی تپش، یہاں کی گنگا جمنی تہذیب، یہاں کا کلچر، یہاں کے تہوار، یہاں کے شادی بیاہ کے رسوم سب کچھ وہی ہے۔ گنگا اشنان کرتی لڑکیاں ہیں جو بجرے پر گنگا درشن کے مزے لے رہی ہیں، سنگم کے گھاٹوں کی البیلی منظر نگاری ہے جہاں مہ جبینوں کے پرے کے پرے مقدس غسل میں مصروف ہیں اور ان کا اشنان ایک خاص قسم کی جمالیاتی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو:

گنگا اشنان، یہ چمکتے بجرے ناؤں میں سوار مہ جبینوں کے پرے
سنگم میں لگا کے غوطہ اُٹھتا ہے یہ کون؟ موجوں کے بھنور سے جیسے زہرہ اُبھرے

گنگا اشنان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فراقؔ کہتے ہیں کہ بجروں اور کشتیوں میں مہ جبینیں سوار ہیں۔ یہ ایک حسین نظارہ ہے اور یہ حسینائیں جب سنگم میں اشنان کے دوران غوطے لگا کے باہر نکلتی ہیں تو ایسا لگتا ہے جیسے موجوں کے بھنور سے زہرہ طلوع ہو رہی ہے۔ اس رباعی میں تلمیح کا استعمال کیا گیا ہے۔ رکشا بندھن کا تہوار ہندوستان کا بہت ہی مقدس اور پاک تہوار ہے، جس میں بہن اپنے بھائی کو راکھی باندھتی ہے اور بھائی ساری دنیا کے مصائب سے اپنی بہن کو محفوظ رکھنے کا عزم دہراتا ہے۔

فراقؔ نے اس کیفیت اور جذبے کو کس خوب صورت انداز میں اپنی رباعی میں قید کیا ہے:

رکشا بندھن کی صبح ، رَس کی پتلی　　چھائی ہے گھٹا گگن پہ ہلکی ہلکی
بجلی کی طرح لچک رہے ہیں لچھے　　بھائی کے ہے باندھتی چمکتی راکھی

☆

پریمی کے ساتھ کھانے کا وہ عالم　　ہلکے پہ وہ ہاتھ جسمِ نازک میں وہ خم
لقمے کے اُٹھانے میں کلائی کی لچک　　دل کش کتنا ہے منہ کا چلنا کم کم

اس رباعی میں فراقؔ نے محبوب کے ساتھ ہم طعامی کے لطف کو بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کا کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا اور لقمہ اُٹھاتے وقت بدن میں خم اور کلائی میں لچک پیدا ہو جانا اور شرم کے باعث دھیرے دھیرے لقمے چبانا ایک نہایت دل کش نظارہ ہے۔

فراقؔ کے یہاں ہندوستانی بو باس رکھنے والے محبوب کی سراپا نگاری ان کی تقریباً تین چوتھائی سے زیادہ رباعیات پر حاوی ہے اور ان کے مجموعۂ کلام روپ میں تقریباً سبھی رباعیاں، جن کی تعداد کثیر ہے، اسی انداز کی ہیں، چند ملاحظہ فرمائیں:

وہ اک گہرا سکوت ، کل رات گئے　　طاقوں پہ دِیے نیند میں ڈوبے ڈوبے
پلکیں جھپکا رہی تھیں جب ٹھنڈی ہوائیں　　آنا ترا اک نرم اچانک پن سے

☆

قامت ہے کہ اَنگڑائیاں لیتی سَرگم　　ہو رقص میں جیسے رنگ و بُو کا عالم
جگ مگ جگ مگ ہے شبستانِ اِرَم　　یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم

ان رباعیوں میں فراق کا احساسِ جمال پوری طرح بیدار نظر آتا ہے۔ یہاں گوشت پوست کی ہندوستانی عورت محبوبہ کی شکل میں اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ ہنستی بولتی، لجاتی اور دل لبھاتی ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ صرف عاشق کے قلب کی واردات اور نفسیاتی کیفیات کے بیان پر ہی قناعت نہیں کر لی گئی ہے بلکہ محبوب کی باطنی کیفیت اور ذہنی و جذباتی صورتِ حال کی تمام نزاکتیں پوری طرح ان رباعیوں میں جلوہ گر ہوئی ہیں۔

﴾دیومالائی عناصر﴿: فراقؔ کی رباعیوں میں دیومالائی عناصر کی پذیرائی ان کے ہندوستانی ذہن اور طرزِ فکر کی آئینہ دار ہے۔

فراقؔ کی رباعیوں میں ہندوستانی سماج اور ہندستانی طرزِ فکر کے چراغ جل اُٹھے ہیں۔ ہندو اساطیر اور ہندو مذہب کے مشہور کرداروں کا ان کے تلمیحاتی پس منظر میں فراقؔ نے اکثر جگہ ذکر کیا ہے۔ سیتا، سلوچنا، رادھا، رام، کرشن، سدھارتھ اور

ارجن وغیرہ فراقؔ کے کلام میں اپنے وسیع پس منظر کے ساتھ اُبھرے ہیں۔کرشن کی بانسری، رام کا بن باس، کیکئی کے فتنے، رتی، کام دیو، سیتا کی پاکیزگی اور شیو کی جٹا سے گنگا کا اُترنا، کے تلازمے دیو مالائی پس منظر کے رہینِ منت ہیں اور اپنے اندر معنویت کی ایک نئی دنیا سمیٹے ہوئے ہیں۔

رشکِ دل کیکئی کا فتنہ ہے بدن سیتا کے برہ کا کوئی شعلہ ہے بدن
رادھا کی نگاہ کا چھلاوا ہے کوئی یا کرشن کی بانسری کا لہرا ہے بدن

فراقؔ مذکورہ رباعی میں ہندو اساطیر سے فائدہ حاصل کرتے ہوئے محبوب کے بدن سے اُٹھنے والے فتنہ کو کیکئی کی فتنہ پروری سے تشبیہ دیتے ہیں اور مزید کہتے ہیں کہ اس کا بدن گویا سیتا کے ہجر کا کوئی شعلہ ہے، یا رادھا کی نگاہ سے اُٹھنے والا وہ چھلاوا ہے جس پر کرشن کی بانسری وجد میں لہرا رہی ہے۔

﴿رباعیاتِ فراقؔ کی زبان﴾: فراقؔ کی رباعیوں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ہندی ماحول اور ہندوستانی تشبیہات و تلمیحات کا استعمال کثرت سے ہوا ہے جس سے یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ان کا محبوب ہندوستان ہی کا ہے اور اس پر ایران و عرب کے اثرات کم سے کم مرتسم ہوئے ہیں۔رباعیوں میں ہندی کی ریت کال کی جھلک ملتی ہے۔ثبوت کے طور پر چند رباعیاں پیش کی جاتی ہیں:

ہونٹوں میں وہ رَس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سوجائے
چہرے کی دَمک پہ جیسے شبنم کی رِدا مد آنکھوں کا، کام دیو کو بھی جو چھکائے

☆

ہر جلوہ سے اک درسِ نمو لیتا ہوں چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

فراقؔ کی رباعیوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ہندی اور سنسکرت کے نرم، سبک، شیریں، مناسب اور برمحل الفاظ کا استعمال خاص طور سے کیا ہے۔لفظوں کے انتخاب کے سلسلے میں وہ خاصے حسن پرست واقع ہوئے ہیں۔لفظوں کی مینا کاری وہ اس انداز سے کرتے ہیں کہ ہماری جمالیاتی حس بیدار رہتی ہے، اور لفظوں کا سنگیت ہمارے کانوں میں رس گھول دیتا ہے۔فراقؔ کا خیال ہے کہ اردو زبان کو زیادہ مالا مال بنانے کے لئے ضروری ہے کہ عربی و فارسی الفاظ کی طرح ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کے استعمال سے بھی اجتناب نہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں ان کے خیالات ملاحظہ ہوں:

> ''اردو کو سنسکرت اور ہندی شاعری دونوں کی قدروں سے استفادہ کرنا ضروری ہے، صرف بھاشا کی شاعری سے استفادہ کرنا اور شاعری کو ہندوستانی کلچر اور اس کی روح کا صحیح نمائندہ اور آئینہ دار نہیں بنا سکتا۔
> ...... ان رباعیوں میں میں نے کوشش کی ہے کہ موقع موقع سے نہایت احتیاط سے سنسکرت الفاظ لائے جائیں اور اردو کی فصاحت میں بالکل فرق نہ آنے پائے۔''

جب چاند نے اَمرت کی گگر چھلکائی　　جب ہم رگر نے سرد ہوا سنکائی
لرزش تنِ نازک میں ہوئی رات گئے　　یا چاندنی پڑتے ہی لتا لہرائی

﴿**رباعیاتِ روپ کی خامیاں**﴾: فراؔق کی رباعیوں پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کی یہ رباعیاں روایت سے ہٹی ہوئی ہیں۔فراؔق کی رباعیوں میں اکثر کی ساخت ایسی ہے کہ تاثیر اور معنی آفرینی کے لحاظ سے چاروں مصرعے یکساں ہوتے ہیں۔رباعی کے عام انداز کے برعکس ان کی رباعیوں میں چوتھا مصرع اچانک اور چونکا دینے والے انداز سے نہیں آتا۔ایک بات یہ کہی جاتی ہے کہ فراؔق دیومالا کی پیش کش میں کہیں کہیں تسامح کا شکار بھی ہوگئے ہیں۔تاریخی اور دیومالائی واقعات کو نظم کرنے میں انہوں نے ان صداقتوں کو ملحوظِ نظر نہیں رکھا ہے جس طرح وہ مذہبی، کتابی اور تاریخی کتابوں میں استعمال ہوئے ہیں۔مثال کے طور پر پرانوں کے مطابق چاند کے رَتھ میں سات ہرن ضرور جُتے ہیں لیکن وہ عیش پرست دیوتا ہے، دیوی ہرگز نہیں۔فراؔق نے زیرِ نظر رباعی میں اس کی جنس ہی تبدیل کردی ہے:

چھَن چھَن کے پڑے جہاں ستاروں کی کرن　　پریاں دیں خود جسے ہوائے دامن
وہ رُوپ نگر کا بَن ہے رَمنا تیرا　　چرتے ہیں جہاں چاند کی دیوی کے ہرن

اسی طرح ایک رباعی میں انہوں نے سرسوتی سے ستار بجوایا ہے۔فنونِ لطیفہ کی دیوی سے راگ الاپ کرایا ہے۔دیومالا کے مطابق وہ بین بجاتی ہے ستار نہیں، وہ گاتی بھی ہرگز نہیں۔یہاں ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ فراؔق کو ان واقعات کے درست تسلسل کا علم نہیں ہے، یا وہ پرانوں سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔ہاں تاریخی واقعات کے انتخاب میں ان سے تسامح سرزد ہوا ہے اور جذبے کی شدت اور فراوانی کے مقابلے میں تاریخی حقائق کو نظرانداز کرگئے ہیں۔

آثؔر لکھنوی نے اپنے مضمون ''روپ میری نظر میں'' میں فراؔق کی رباعیوں کے پانچ نقائص پر روشنی ڈالی ہے، جن میں ناموزوں مصرعے، حشو وزوائد، الفاظ کے صحیح تلفظ سے بے نیازی اور غیر مہذب الفاظ کا استعمال بھی شامل ہیں۔اردو رباعی کو فراؔق کی دین یہ ہے کہ انہوں نے اس صنف کو موضوعات کی تازگی اور دل آویزی عطا کی۔رباعی میں تنوع اور رنگارنگی پیدا کرنے میں اردو کا شاید ہی کوئی شاعر فراؔق کی ہمسری کرسکے۔

﴿**رباعی گوئی میں فراؔق کا امتیاز**﴾: فراؔق نے باعتبارِ مضامین صنف رباعی کی اس روایت سے بغاوت کی ہے جس کے لئے یہ صنف مخصوص سمجھی جاتی تھی یعنی عام طور سے رباعی میں ناصحانہ، حکیمانہ، فلسفیانہ اور اخلاقی مضامین نظم کیے جاتے تھے۔فراؔق نے سنگار رَس اور جمالیات کو موضوعِ سخن بنایا اور اس میدان میں احساسِ جمال کے وہی گل بوٹے کھلائے ہیں جو ان کی غزلیات کا طرۂ امتیاز ہیں یعنی حسن، خوب صورتی، جسم انسانی کی آنچ، لمس ولذت، عشقِ مجازی کی نیرنگیاں وغیرہ ان کے موضوعات رہے ہیں یہی سب مضامین انہوں نے رباعیوں میں بھی برتے ہیں اور ان میں ہندوستانی زندگی کے مختلف نقوش شامل کرکے ان کے حسن میں اضافہ کردیا ہے۔یہ فراؔق کا بڑا کارنامہ ہے۔رباعیوں میں سنسکرت اور ہندی کے نرم اور سبک الفاظ بڑی خوب صورتی اور روانی سے استعمال کیے گئے ہیں۔اردو زبان کے لئے یہ ایک فالِ نیک ہے۔اردو زبان کی تشکیل اور ادب کے ارتقا کی تاریخ بھی اس اصول کی تصدیق کرے گی۔

08.05 رباعیاتِ فراقؔ (اقتباس)

﴿۱﴾

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

﴿۲﴾

دوشیزہ، فضا میں لہلہایا ہوا روپ آئینۂ صبح میں جھلکتا ہوا روپ
یہ نرم نکھار ، یہ سج دھج ، یہ سگندھ رَس میں ہے کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

﴿۳﴾

تُو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے دُکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں سکھ شانت کی گویا تُو ہری کھیتی ہے

﴿۴﴾

آنکھوں میں سرشک، جگمگاتا مکھڑا وہ جشنِ رُخصتی ، سہانا تڑکا
جھرمٹ میں سہیلیوں کے، اُٹھتے ہیں قدم وہ گھر کی عورتوں کا بابل گانا

﴿۵﴾

ساغر کفِ دست میں، صراحی بہ بغل کاندھے پہ گیسوؤں کے کالے بادل
یہ مدھ بھری آنکھ ، یہ نگاہیں چنچل ہے پیکرِ نازنین کہ حافظؔ کی غزل

﴿۶﴾

چہرہ دیکھے تو رات غم کی کٹ جائے سینہ دیکھے تو اُمنڈا ساگر ہٹ جائے
سانچے میں ڈھلا ہوا یہ شانہ، یہ بغل جیسے گلِ تازہ کھلتے کھلتے پھٹ جائے

﴿۷﴾

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سَرگَم ہو رقص میں جیسے رنگ و بُو کا عالم
جگ مگ جگ مگ ہے شبنمستانِ اِرَم یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم

﴿۸﴾

ہونٹوں میں وہ رَس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سوجائے
چہرے کی دَمک پہ جیسے شبنم کی رِدا مد آنکھوں کا ، کام دیو کو بھی جو چھکائے

﴿۹﴾

ہر جلوہ سے اک درسِ نمو لیتا ہوں　　چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ　　سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

﴿۱۰﴾

جب چاند نے اَمرت کی گگر چھلکائی　　جب ہم رُگر نے سرد ہوا سنکائی
لرزش تنِ نازک میں ہوئی رات گئے　　یا چاندنی پڑتے ہی لتا لہرائی

08.06 رباعیاتِ فراقؔ (تشریح)

کس پیار سے دے رہی ہے میٹھی لوری　　ہلتی ہے سڈول بانہہ گوری گوری
ماتھے پہ سہاگ، آنکھوں میں رس، ہاتھوں میں　　بچے کے ہنڈولے کی چمکتی ڈوری

آپ کے نصاب میں شامل پہلی رباعی میں فراقؔ ایک ایسی روایتی ہندوستانی ماں کا بیان کررہے ہیں جو اپنے بچے کو پالنے میں جھولا جھلا رہی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اسے میٹھی میٹھی لوریاں بھی سناتی جارہی ہے تا کہ بچے کو جلد نیند آجائے اور گہری نیند آئے۔ اس دوران ماں کی خوب صورت اور گوری بانہیں، ماتھے پہ سہاگ کی نشانی، آنکھوں میں محبت کا جذبہ اور ہاتھوں میں بچے کے جھولے کی ڈوری لہرارہی ہے۔ ایک طرف ممتا کا پاک اور مقدس روپ اور دوسری طرف ایک ہندوستانی عورت کا یہ حسین مرقع، فراقؔ کی حسن پرست نگاہوں نے تقدس اور رومان کا ایک ایسا حسین سنگم پیدا کیا ہے کہ یہ رباعی مرقع نگاری کی عمدہ مثال بن گئی ہے۔

دوشیزہ، فضا میں لہلہایا ہوا روپ　　آئینۂ صبح میں جھلکتا ہوا روپ
یہ نرم نکھار، یہ سج دھج، یہ سگندھ　　رَس میں ہے کنوارے پن کے ڈوبا ہوا روپ

دوسری رباعی میں فراقؔ ایک کنواری لڑکی کو فضا کے کنوارے پن سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک ایسے عالم میں جب کہ فضا پر دوشیزگی طاری ہے، ایک دوشیزہ کا روپ بھی اسی انداز میں لہلہا رہا ہے اور اسی فضا کی دوشیزگی کی عمدہ مثال انہوں نے آئینۂ صبح کی ترکیب میں پیش کی ہے یعنی وہ خوب صورت دوشیزہ آئینۂ فطرت میں اپنے حسن کو عکس بار دیکھ رہی ہے۔ اور اس کی دوشیزگی کی جملہ خصوصیات کو سمیٹتے ہوئے آخری مصرعے میں کہتے ہیں کہ ایسا لگتا ہے کہ کنوارے پن کے حسن و جمال میں اس دوشیزہ کا سراپا ڈوب گیا ہے۔

تُو ہاتھ کو جب ہاتھ میں لے لیتی ہے　　دُکھ درد زمانے کے مٹا دیتی ہے
سنسار کے تپتے ہوئے ویرانے میں　　سکھ شانت کی گویا تُو ہری کھیتی ہے

تیسری رباعی میں فراقؔ رفیقۂ حیات سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں دنیا کے تمام رنج و غم اس وقت کافور ہو جاتے ہیں جب تو اپنے ہاتھوں میں میرا ہاتھ لے لیتی ہے مزید کہتے ہیں کہ گویا یہ دنیا ایک تپتا ہوا ویرانہ ہے جس میں رفیقۂ حیات کا وجود ایک لہلہاتے ہوئے سرسبز کھیت کی مانند ہے۔

آنکھوں میں سرشک، جگمگاتا مکھڑا　　وہ جشنِ رُخصتی، سہانا تڑکا
جھرمٹ میں سہیلیوں کے، اُٹھتے ہیں قدم　　وہ گھر کی عورتوں کا بابل گانا

چوتھی رباعی میں ہندوستانی معاشرے میں شادی میں عام طور پر لڑکی کی رخصت صبح کے وقت ہوتی ہے۔اس تہذیبی روایت کوفراقؔ نے مذکورہ رباعی میں بڑی خوب صورتی سے پیش کیا ہے۔لڑکی کا رخصت ہونا ایک مذہبی فریضہ ہےاوراس کی جدائی ماں باپ کے لئے موردِ آلام بھی۔لہٰذا مصرعِ اولیٰ میں ان دونوں مناسبتوں سے آنکھوں میں آنسواور چہرے پرمسرت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔عورتوں کے بابل گانے کی آوازاور سہیلیوں کے جھرمٹ میں ایک لڑکی کے قدم جب سسرال کی جانب اُٹھتے ہیں اس کیفیت کی عکاسی اس رباعی میں کی گئی ہے۔

ساغر کفِ دست میں، صراحی بہ بغل — کاندھے پر گیسوؤں کے کالے بادل
یہ مدھ بھری آنکھ ، یہ نگاہیں چنچل — ہے پیکرِ نازنین کہ حافظؔ کی غزل

پانچویں رباعی میں فراقؔ ایک پیکرِحسن کی تعریف میں اپنے فنی کمال کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب کوئی حسین اپنے کاندھے پر سیاہ گیسولہرائے ہوئے ، ہاتھوں میں ساغراور بغل میں صراحی دبائے ہوئے اوراپنی مدہوش آنکھوں اورچنچل نگاہوں کے جلوے بکھیرتی ہےتو ایسامحسوس ہوتا ہے کہ یہ حسن کا پیکر گویا حافظ کی غزل ہے۔

چہرہ دیکھے تو رات غم کی کٹ جائے — سینہ دیکھے تو اُمنڈا ساگر ہٹ جائے
سانچے میں ڈھلا ہوا یہ شانہ، یہ بغل — جیسے گلِ تازہ کھلتے کھلتے پھٹ جائے

چھٹویں رباعی میں ہمارے شعرا عموماً غمِ دوراں کا علاج غمِ جاناں سے کیا کرتے ہیں۔اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے فراقؔ اس رباعی میں کہتے ہیں کہ اس کے چہرہ کی ایک جھلک شبِ ہجراں کے غم کو مٹا دیتی ہے۔اوراس کے سینے کی سرمستی وسرشاری کی وہ کیفیت ہے جس پر سمندر کو بھی رشک آئے۔اس کے جسم کے مختلف اعضا کی بھرپور جوانی کا یہ عالم ہے کہ جیسے جوشِ شباب میں کلی چٹک کر پھول بن جاتی ہے۔

قامت ہے کہ انگڑائیاں لیتی سَرگَم — ہو رقص میں جیسے رنگ و بُو کا عالم
جگ مگ جگ مگ ہے شبنمستانِ اِرَم — یا قوسِ قزح لچک رہی ہے پیہم

ساتویں رباعی میں فراقؔ نے اپنے محبوب کے قامت کی خوب صورتی کومختلف تشبیہات کی مدد سے بیان کیا ہے۔وہ کہتے ہیں کہ اس کا سراپا گویا انگڑائیاں لیتی ہوئی سرگم ہے یا اس کا قد یوں ہے جیسے رنگ و بو کا عالم رقص کر رہا ہے۔ جنت کا شبستان جگمگا رہا ہے یا آسمان پر قوسِ قزح مسلسل لچک رہی ہے۔

ہونٹوں میں وہ رَس کہ جس پہ بھونرا منڈلائے — سانسوں کی وہ سیج جس پہ خوشبو سوجائے
چہرے کی دَمک پہ جیسے شبنم کی رِدا — مدآنکھوں کا ، کام دیو کو بھی جو چھکائے

آٹھویں رباعی یہ فراقؔ کی قدرتِ زبان وبیان کی عکاس ہے،مثلاً محبوب کے ہونٹوں میں وہ رَس جس کی کشش بھونرے کواپنے پاس آنے پر مجبور کردے۔سانس گویا ایسا بستر ہے جس پر خود خوشبو کو نیند آجائے۔ چہرے کی دمک گویا شبنم کے لئے چادر کی حیثیت رکھتی ہے اور آنکھوں میں وہ نشہ ہے جو کام دیو (محبت کا دیوتا) کو بھی اپنی جانب راغب کرلے۔ مذکورہ رباعی میں فراقؔ کے ہندی کے نرم اور سبک الفاظ کے استعمال کے ذریعہ اپنی قادرالکلامی کا ثبوت دیا ہے۔

ہر جلوہ سے اک درسِ نمو لیتا ہوں — چھلکے ہوئے صد جام و سبو لیتا ہوں
اے جانِ بہار! تجھ پہ پڑتی ہے جب آنکھ — سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہوں

نویں رباعی میں فراقؔ اپنے محبوب کو ایسی جانِ بہار قرار دیتے ہیں جس کے جلوے سے انہیں بالیدگی اور نمو کا درس ملتا ہے اور گویا کئی لبریز جام وسبوان کے ہاتھوں میں آجاتے ہیں اور جب اس پر ان کی نظر پڑتی ہے تو اس نظارے میں ایسی موسیقیت اور غنائیت کا احساس ہوتا ہے جو سنگیت کی سرحدوں کو چھو لیتا ہے۔

جب چاند نے اَمرت کی گگر چھلکائی — جب ہم گر نے سرد ہوا سنکائی
لرزش تنِ نازک میں ہوئی رات گئے — یا چاندنی پڑتے ہی لتا لہرائی

آپ کے نصاب میں شامل دسویں رباعی میں فراقؔ کہتے ہیں کہ جب چاند اپنے شباب پر آیا اور اس نے اَمرت کی گاگر چھلکائی اور جب برفیلے پہاڑوں سے سرد ہوائیں چلیں تو رات ڈھلے محبوب کے تن نازک میں وہ کپکپی پیدا ہوئی جیسے چاندنی میں انگور کی بیلیں لہراتی ہیں۔ اس رباعی میں زبردست مرقع نگاری ہے۔

08.07 رگھوپتی سہائے فراقؔ گورکھپوری کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

رَگ رَگ میں تھرتھراتے رَس کا یہ اُبال — جس طرح چھلک رہا ہو مینائے جمال
یہ بَل کھاتی ہوئی سُنہری لہریں — شفاف بدن ہے یا طلوعِ سیّال

﴿۲﴾

موتی کے ہار بَن کے، پھولوں میں رہی — راتوں کا چراغ بَن کے، تا صبح جلی
پَر لگ گئے، جب سحر کے غنچے چٹکے — پڑتے ہی کرن، اُڑی وہ شبنم کی پَری

﴿۳﴾

یہ پچھلی رات، رُوپ بے سُدھ ہے نپٹ — آتی ہے کانپتی لتاؤں کی لپٹ
یہ آدھے بدن تک کُھلے اَلکوں کی لٹیں — یہ رنگِ بدن، یہ مہکی مہکی کروٹ

﴿۴﴾

آہٹ ہے نسیم کی حضوری کا پیام — جُھکتے ہیں چمن والے، ادب کا ہے مقام
پھولوں میں کھڑا جام بہ کف وقتِ سحر — گُل زَارِ جہاں کا کوئی لیتا ہے سلام

﴿۵﴾

یہ موجِ نسیم، یہ سُہانا تڑکا — دامانِ شفق فضا میں لٹکا لٹکا
پُورب کو مُنہ کیے سُہاگن ہے کھڑی — آنچل دوشِ حسیں سے ڈھلکا ڈھلکا

﴿۶﴾

یہ رُوپ کی موہنی ، یہ اَبرو کے ہلال
اَنگ اَنگ کی یہ لچک، یہ گاتی ہوئی چال
یہ لوچ ہوائے شام ہو جس پر نثار
آنچل میں لیے ہزاروں تاروں کا جمال

﴿۷﴾

پورے جوبَن پہ جیسے مہکی ہوئی رات
کلیوں میں موج زَن جیسے رُوحِ نبات
وہ عالَمِ رنگِ وبُو ہے تجھ پراے دوست!
شاعر کے لبوں پہ جیسے پیغامِ حیات

﴿۸﴾

ڈھلکا آنچل ، دَمکتے سینے پہ اَلک
پلکوں کی اوٹ، مُسکراہٹ کی جھلک
وہ ماتھے کی کہکشاں، وہ موتی بَھری مانگ
وہ گودی میں چاند سا ہُمکتا بالک

﴿۹﴾

آنگن میں لیے چاند کے ٹکڑے کو کھڑی
ہاتھوں پہ جُھلاتی ہے اُسے گود بَھری
رہ رہ کے ہوا میں جو لَوکا دیتی ہے
گُونج اُٹھتی ہے کھِلکِھلاتے بچّے کی ہنسی

﴿۱۰﴾

ہے بیاہتا، پر رُوپ ابھی کنوارا ہے
ماں ہے، پر اَدا جو بھی ہے، دوشیزہ ہے
وہ مود بَھری ، مانگ بَھری ، گود بَھری
کنّیا ہے، سُہاگن ہے، جگت ماتا ہے

﴿۱۱﴾

یہ مہلکے سَلونے، سانولے پَن کا سماں
جمنا جَل میں اور آسمانوں میں کہاں؟
سِیتا پہ سوئمبر میں پڑا رَام کا عکس
یا چاند سے مُکھڑے پہ ہے زلفوں کا دُھواں

﴿۱۲﴾

مَدھوبَن کے بسنت سا سجیلا ہے وہ رُوپ
برکھا رُت کی طرح رَسیلا ہے وہ رُوپ
رادھا کی جھجک ، کرشن کی بَرزوری ہے
گوکُل نگری کی راس لیلا ہے وہ رُوپ

﴿۱۳﴾

جب جھُولا جُھولنے میں ساون وہ گائے
کروٹ قوسِ قزح کو رہ رہ کے دِلائے
وہ پینگ بڑھانے میں لچکتا ہوا جسم
آئینۂ نیل گُوں میں بجلی لہرائے

﴿۱۴﴾

کروٹ سے سو رہی ہے کھولے گیسو پَو پھٹتی ہے یا جھلک رہا ہے پہلو
پَل کر کتنا مانوس ہو گیا ہے تلووَں سے مَل رہا ہے آنکھیں آہو

﴿۱۵﴾

آنسو بھرے بھرے وہ نَینا رَس کے ساجن کب اے سَکھی! تھے اپنے بَس کے
یہ چاندنی رات، یہ برِہ کی پیڑا جس طرح اُلٹ گئی ہو ناگن، ڈس کے

﴿۱۶﴾

دوشیزۂ بہار مُسکرائے جیسے موجِ تسنیم گنگنائے جیسے
یوں پُھوٹ رہی ہے مُسکراہٹ کی کرن بَل کھاتی ہوئی نسیم گائے جیسے

﴿۱۷﴾

رَگ رَگ میں جوانی کی سُلگتی ہوئی آگ رَتنار آنکھوں کا رَس مچاتا ہوا پھاگ
ہر خطِ بدن کی جگمگاتی ہوئی لَو وہ رُوپ وَتی پاؤں سے سَر تک ہے سُہاگ

﴿۱۸﴾

گورے ماتھے کی یہ سُہانی مہتاب لیتی ہے رَگوں میں کروٹیں رُوحِ شباب
زلفوں میں ڈھل رہی ہے مَے خانے کی رات آنکھوں سے چھلک چھلک سی جاتی ہے شراب

﴿۱۹﴾

ہر ایک نظر پہ کام کرتی بھی نہیں ہر ایک نگاہ یوں اُترتی بھی نہیں
صدقے ترے دیکھنے کے ظالم! دل پر پڑتی ہے وہ چوٹ جو اُبھرتی بھی نہیں

﴿۲۰﴾

دل تھا کہ کوئی شمعِ شبستانِ حیات اَندھیر ہوا بجھتے ہی، کہنے کی ہے بات
دل ہی تھا کہ جس کا ساتھ دینے کے لئے بیٹھے ہوئے رویا کیے ہم رات کی رات

08.08 خلاصہ

رباعی کے معنی چار کے ہیں۔اس شعری صنف میں چار مصرعے ہوتے ہیں جو فکر وخیال کے اعتبار سے اپنے آپ میں مکمل ہوتے ہیں۔چاروں مصرعوں میں خیال مربوط، مسلسل اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔آخری مصرعے میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے۔چوں کہ آخری مصرعے میں خیال کی تکمیل ہوتی ہے اس لئے شاعر چوتھا مصرع بہت اہتمام اور موثر انداز میں کہنے کی کوشش کرتا ہے۔رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔رباعی کی بحر اور اَوزان مقرر ہیں۔رباعی بحر ہزج میں کہی جاتی ہے اور اس کے چوبیس اَوزان مقرر کیے گئے ہیں۔اس کے

لئے کسی مخصوص موضوع کی قید نہیں ہے۔ عام طور پر اس میں فلسفیانہ، متصوّفانہ، اخلاقی اور مذہبی مضامین نظم کیے جاتے ہیں۔ رباعی کو ترانہ اور دوبیتی بھی کہتے ہیں۔ فراق گورکھ پوری اردو کے ان چند اہم شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں جن کی بدولت رباعی گوئی کی آبرو باقی ہے۔ رباعی گوئی کے میدان میں ان کا کارنامہ بہت زبردست ہے۔ ''روپ'' ان کی رباعیوں کا مجموعہ ہے، جو ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ فراقؔ نے ان رباعیوں کی بدولت رباعی کی روایت میں ایک شان دار عنصر کا اضافہ کیا ہے۔ فراقؔ سے قبل رباعی گوئی کے بنیادی موضوعات حکمت، فلسفہ، اخلاقیات، حمد و نعت و منقبت، عشقِ حقیقی اور تصوّف وغیرہ تھے لیکن فراقؔ نے اس میں ہندوستانی عناصر و تلمیحات اور اساطیر، نیز ہندوستانی گھرانوں کی فضا کو شامل کر کے اسے ہماری زندگی سے بہت قریب کر دیا۔

اردو میں سب سے پہلے دکنی شعرا نے رباعیوں کی جانب توجہ کی۔ کم و بیش تمام اہم شعرا کے کلام میں رباعیاں موجود ہیں۔ قلی قطب شاہ، غواصی، وجہی، علی عادل شاہ ثانی، شاہی اور نصرتی کے کلام میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ دکن کے ابتدائی شعرا نے حسن و عشق، عشق مجازی اور شراب و شباب کے مضامین کو بھی رباعی کے موضوعات میں شامل کیا تھا۔ جب شمالی ہندوستان میں اردو شاعری کا چرچا عام ہوا تو ابتدا سے ہی غزل کے ساتھ ساتھ رباعیات بھی لکھنے کا رواج رہا۔ ابتدائی دور کے شعرا میں میرؔ، سوداؔ، دردؔ، مصحفیؔ، میر حسن، قائمؔ چاند پوری نے خاصی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ انشاء اللہ خاں انشاؔ نے رباعی میں جدّت پیدا کی اور ریختی کے مضامین رباعیوں میں برتے۔ انیسؔ و دبیرؔ نے مرثیہ کے ساتھ ساتھ واقعاتِ کربلا کے موضوع پر مشتمل بہت ساری رباعیاں تخلیق کی ہیں انہیں رثائی رباعی کے مخصوص نام سے پکارا گیا۔ دہلی میں غالبؔ، ذوقؔ اور مومنؔ کے کلام میں بھی رباعیاں ملتی ہیں۔

جب نظم جدید کا دَور شروع ہوا تو نظم کے ساتھ ساتھ رباعی نے بھی خوب مقبولیت حاصل کی۔ حالیؔ اور اکبرؔ کی رباعیوں کے اصلاحی، سیاسی، فلسفیانہ اور ناصحانہ انداز نے ملک وقوم میں بیداری کی لہر دَوڑانے میں اپنا کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی میں رباعی گوئی ایک نئی شان کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ امجدؔ حیدر آبادی، جگت موہن لال رواںؔ تو ایسے شاعر تھے جنھوں نے صرف رباعی گوئی کی بدولت تاریخِ ادب میں اپنا مقام پیدا کیا۔ جوشؔ ملیح آبادی اور فراقؔ گورکھ پوری نے رباعی گوئی کو نئی جہتوں اور نئے مضامین سے مالا مال کیا۔ خمریات و مذہبیات سے تو رباعیاں بھری پڑی ہیں معشوق کے جسمانی اعضا کا بیان جو اردو رباعی میں معدوم تھا اسے فراقؔ گورکھ پوری نے بھرپور توسیعی انداز میں بیان کیا ہے۔

اردو رباعیات کے سرمایہ پر نگاہ ڈالی جائے تو نظر آتا ہے کہ ہمارے کم و بیش تمام رباعی گویوں نے موت، بے ثباتیِ دنیا، قناعت، خودداری، انسان دوستی، جبر و قدر اور اسی قسم کے دیگر فلسفیانہ مضامین ہی پر طبع آزمائی کی ہے۔ بہت ہوا تو عمر خیام کے انداز میں خمریہ مضامین کی شراب رباعی کے پیانے میں بھر دی گئی۔ حسن و عشق کے سچے تجربات جن کی جھلکیاں غزل میں نظر آتی ہیں۔ رباعی کے پیرایے میں بہت کم بیان کیے گئے ہیں۔ فراقؔ سے پہلے رباعی کے مضامین ایک مخصوص دائرے میں اسیر تھے۔ فراقؔ نے انہیں اس محدود حصار سے آزاد کر کے انسانی تجربات کی رنگارنگی سے روشناس کیا۔

08.09 فرہنگ

ارضیت	: ایسے بیانات جس میں زمین اور مٹی کی خوشبو شامل ہو	رفیقۂ حیات	: بیوی
		فالِ نیک	: اچھا شگون

جسمانیات	: جسم سے متعلق، مختلف اعضائے جسمانی کا شاعرانہ بیان	قدما	: قدیم کی جمع، اگلے لوگ
		گج گامنی	: ہاتھی جیسی متوالی چال والی
حشو وزوائد	: بے ضرورت اور بھرتی کی چیز	مہمیز کرنا	: ایڑ لگانا، آگے بڑھانا
دیومالائی عناصر	: قدیم دیوی دیوتاؤں کے قصوں کا ذکر، خیالی کہانیاں	مینا کاری	: سونے چاندی پر مرصع سازی کرنا

08.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبر۱　روپ کی رباعیوں کے پس منظر پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲　اردو کے چند اہم رباعی گو شعرا کی نشان دہی کیجیے۔

سوال نمبر۳　فراقؔ کی رباعیوں پر کیا اعتراضات کیے گئے، مختصراً لکھیے۔

تفصیلی سوالات

سوال نمبر۱　فراقؔ نے اردو رباعی میں کیا جدت کی ہے؟ روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۲　فراقؔ گورکھ پوری کے حالاتِ زندگی اور تصانیف پر روشنی ڈالیے۔

سوال نمبر۳　فراقؔ کی رباعیوں کے امتیازی اوصاف بتائیے، نیز انہیں مثالوں سے واضح کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبر۱　: فراقؔ کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) گورکھ پور میں　(ب) لکھنؤ میں　(ج) کلکتہ میں　(د) بنارس میں

سوال نمبر۲　: فراقؔ کی پیدائش کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۹۷ء میں　(ب) ۱۸۹۶ء میں　(ج) ۱۸۹۸ء میں　(د) ۱۸۹۹ء میں

سوال نمبر۳　: فراقؔ کی وفات کہاں ہوئی؟

(الف) ناسک میں　(ب) لدھیانہ میں　(ج) دہلی میں　(د) لکھنؤ میں

سوال نمبر۴　: فراقؔ کی وفات کب ہوئی؟

(الف) ۱۹۸۷ء میں　(ب) ۱۹۹۶ء میں　(ج) ۱۹۹۸ء میں　(د) ۱۹۸۲ء میں

سوال نمبر۵　: فراقؔ کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) رگھوپتی سہائے　(ب) دُرگا سہائے　(ج) دُرگا پرساد　(د) وکاس پانڈے

سوال نمبر۶ : ''روپ'' کس کی رباعیوں کا مجموعہ ہے؟

(الف) جوشؔ ملیح آبادی کی (ب) فراقؔ گورکھ پوری کی (ج) امجدؔ حیدرآبادی کی (د) میرانیسؔ کی

سوال نمبر۷ : ''روپ'' کی اشاعت کب ہوئی؟

(الف) ۱۹۴۴ءمیں (ب) ۱۹۴۳ءمیں (ج) ۱۹۴۷ءمیں (د) ۱۹۴۸ءمیں

سوال نمبر۸ : فراقؔ کی رباعیوں کا مرکزی کردار کیا ہے؟

(الف) بوڑھے (ب) بچے (ج) مرد (د) عورت

سوال نمبر۹ : کس شاعر کی رباعیاں دکنی رباعیوں کی توسیع ہیں؟

(الف) فراقؔ کی (ب) جوشؔ کی (ج) میرانیسؔ کی (د) مرزادبیرؔ کی

سوال نمبر۱۰ : کس شاعر کی رباعیاں روایت سے بغاوت کا استعارہ ہیں؟

(الف) مرزادبیرؔ کی (ب) فراقؔ کی (ج) میرانیسؔ کی (د) جوشؔ کی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) گورکھ پور میں

جواب نمبر۲ : (ب) ۱۸۹۶ءمیں

جواب نمبر۳ : (ج) دہلی میں

جواب نمبر۴ : (د) ۱۹۸۲ءمیں

جواب نمبر۵ : (الف) رگھوپتی سہائے

جواب نمبر۶ : (ب)فراقؔ گورکھ پوری کی

جواب نمبر۷ : (ج) ۱۹۴۷ءمیں

جواب نمبر۸ : (د) عورت

جواب نمبر۹ : (الف) فراقؔ کی

جواب نمبر۱۰ : (الف) فراقؔ کی

08.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ از سلام سندیلوی

۲۔ اردو رباعیات از سلام سندیلوی

۳۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ از احتشام حسین

۴۔ اصنافِ ادبِ اردو از قمر رئیس، خلیق انجم

۵۔ فراقؔ گورکھ پوری: ذات وصفات از سیدہ جعفر

۶۔ فراق نمبر (جلد اول ودوم) از نیا دور خاص نمبر، لکھنؤ

اکائی 09　شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی (بحیثیتِ رباعی گو)

ساخت

09.01 : اغراض ومقاصد

09.02 : تمہید

09.03 : شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

09.04 : شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی بحیثیتِ رباعی گو

09.05 : رباعیات جوشؔ ''اقتباس''

09.06 : رباعیات جوشؔ ''تشریح''

09.07 : شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی منتخب دیگر رباعیاں

09.08 : خلاصہ

09.09 : فرہنگ

09.10 : سوالات

09.11 : حوالہ جاتی کتب

09.01　اغراض ومقاصد

اس اکائی کے میں شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی حالاتِ زندگی اورتعلیم وتربیت پرروشنی ڈالی جائے گی۔اس کے ساتھ ہی ان کی ملازمت اورخصوصی طورپران کی رباعی گوئی کے بارے میں سیرحاصل گفتگو کی جائے گی۔اوراس کے بعدہی جوشؔ کی رباعیات سے منتخب کردہ متن کے طورپردس رباعیاں پیش کی جائیں گی۔ساتھ ہی ان رباعیوں کی تشریح بھی کی جائے گی۔اس کے بعدا کائی کا خلاصہ اورالفاظ ومعانی بھی پیش کیے جائیں گے۔اورپھرآخرمیں نمونہ امتحانی سوالات اورحوالہ جاتی کتب کی فہرست بھی پیش کی جائے گی تاکہ آپ جوشؔ کے متعلق ان کتابوں سے استفادہ اوراپنی معلومات میں مزیداضافہ کرسکیں گے۔

09.02　تمہید

اردوشاعری میں علامہ اقبالؔ کے بعدجودوبڑے نام سامنے آتے ہیں ان میں زمانی ترتیب کے اعتبار سے شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کودوسرابڑاشاعرہونے کاشرف حاصل ہے۔اردوکے جدیدشاعروں میں شبیرحسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کامرتبہ بہت بلندہے۔جوشؔ نے اپنی شاعری کاآغازغزل گوئی سے کیاتھا۔مرزااسداللہ خاں غالب کاایک شعرملاحظہ کیجیے:بھی یہی شکایت ہے کہ آپ ان.....

بہ قدرِ شوق نہیں، ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مِرے بیاں کے لئے

یہ شعر بھی جوشؔ کے طبیعت پر کھرا اُترتا ہے۔ مذکورہ شعر میں غالبؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غزل کا میدان میرے شوق کو پورا کرنے کے لئے تنگ ہے۔ مجھے فکر وخیال کے اظہار کے لئے ایک وسیع میدان چاہیے۔ جوشؔ کے پورے کلام کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ جوشؔ کو صنف غزل سے وہی شکایت تھی جو کہ غالبؔ کو تھی۔ یعنی یہ شاعر اس صنف میں اپنی فکر واحساس کا پوری طرح اظہار کرنے سے قاصر تھے۔ اسی بناء پر جوش اردو شاعری کی روایتی صنف سخن کو چھوڑ کر نظم، مرثیے اور رباعی کے میدان میں آ گئے جہاں جوش کو ایسی کامیابی نصیب ہوئی کہ وہ علامہ اقبال کے بعد بیسویں صدی کے دوسرے بڑے عظیم شاعر تسلیم کیے جانے لگے۔ جوشؔ جنگ آزادی کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ بعض نقادوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ جوش ہندوستان کی تمام زبانوں میں جنگ آزادی کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ جوش نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں کی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں۔ جوش کی اکثر رباعیاں اخلاق، فلسفہ، سماجی خرابیوں، مفلسی وغریبی اور مناظر فطرت جیسے موضوعات پر کہی گئی ہیں۔

09.03 شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کے حالاتِ زندگی

جوش کے والد کا نام بشیر احمد خاں اور تخلص بشیرؔ تھا۔ آپ بہت خوب صورت انسان تھے۔ فارسی زبان اور تاریخ اسلام پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ آپ کو سعدیؔ، حافظؔ، اور فردوسیؔ کا پورا کلام اَز بر تھا۔ اردو ادب میں میر تقی میرؔ اور میر انیسؔ کے زبردست مداح تھے۔ شاعری میں پہلے مرزا داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ اس کے بعد امیرؔ مینائی اور جلالؔ لکھنوی سے اصلاح لی۔ اپنے والد کی طرح یہ بھی بہت فیاض تھے ان کی سرکار سے سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور بوڑھوں کا ماہانہ وظیفہ ملتا تھا۔ جوش کی تاریخ ولادت میں اختلاف ملتا ہے۔ کسی نے ۱۸۹۶ء اور کسی نے ۱۸۹۸ء لکھا ہے لیکن خود جوشؔ کا بیان ہے کہ وہ ۵/دسمبر ۱۸۹۸ء کو ملیح آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کا پورا نام شبیر حسن خاں اور جوش تخلص ہے۔ جوشؔ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی مولوی نیاز علی خاں نے انہیں فارسی، مولانا طاہر نے انہیں اردو، مولوی قدرت اللہ بیگ نے عربی اور ماسٹر گومتی پرساد نے انہیں انگریزی پڑھائی۔

جب گھر کی تعلیم مکمل ہوگئی تو انہیں سیتاپور بھیج دیا گیا جہاں فرنچ ایج اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ ڈیڑھ سال تک جوشؔ نے وہاں تعلیم حاصل کی اور پھر ان کے والد نے سیتاپور سے واپس بلا کر لکھنؤ کے حسین آباد اسکول میں داخل کر دیا جہاں جوشؔ نے چھٹی اور ساتویں کے امتحان ایک ساتھ دیئے اور آٹھویں کلاس میں داخل ہو گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انہیں علی گڑھ بھیج دیا گیا اور ایم.اے.او کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ شرارتوں کی وجہ سے علی گڑھ کالج سے نکالے گئے اور پھر واپس آئے اور یہاں جوبلی ہائی اسکول میں داخل ہو گئے۔ اس کے بعد وہ اسی شہر میں چرچ مشن اسکول اور ریڈ کرسچین کالجیٹ اسکول میں داخل ہو گئے۔ لکھنؤ میں قیام کے دَوران جوشؔ نے رسواؔ سے عربی و فارسی کی تعلیم حاصل کی پھر لکھنؤ سے جوشؔ پیٹرز کالج آگرہ چلے گئے۔

آپ آگرہ میں ہی زیر تعلیم تھے کہ آپ کے والد محترم کا انتقال ہو گیا۔ یہ واقعہ ۱۹۱۶ء کا ہے۔ آگرہ میں جوشؔ نے سینئر کیمبرج تعلیم حاصل کی۔ جوشؔ ملیح آبادی نے اپنی خود نوشت سوانح ''یادوں کی بارات'' میں لکھا ہے کہ وہ چھ مہینے شانتی نکیتن میں بھی رہے۔ یہ دن انہوں نے رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ گزارے۔ شانتی نکیتن سے جوشؔ ملیح آبادی واپس آ گئے۔ یہاں ان کے ذمے جائیداد کی دیکھ بھال ہوگئی۔ یہیں انہوں نے انگریزی ادب کا مطالعہ کیا اور فارسی کے بڑے شاعروں کا مثلاً سعدیؔ، حافظؔ، خیامؔ، عرفیؔ اور خاقانیؔ کے کلام کا مطالعہ کیا۔

09.04 شبّیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی بحیثیتِ رباعی گو

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کے والد محترم کو یہ گوارا نہیں تھا کہ ان کا بیٹا جوشؔ شاعری کریں۔آپ کے والد محترم نے اپنی زندگی میں پوری طور یہ کوشش کی تھی کہ جوشؔ شعر گوئی سے باز آجائیں۔اس سلسلے میں جوشؔ نے اپنے پہلے مجموعۂ کلام کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:

''میں نے نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ یہ بات میں نے خلاف واقعہ لکھی ہے۔ کیوں کہ حقیقت یہ ہے کہ میں شعر نہیں کہتا تھا بلکہ شعر خود کو مجھ سے کہلواتا تھا۔''

جوشؔ کے والد محترم شاعری کے اتنے خلاف تھے کہ جوشؔ چوری چھپے شعر کہا کرتے تھے۔اگر کبھی شعر کہتے ہوئے پکڑے جاتے تو انہیں سخت سزا دی جاتی۔کم سے کم سزا یہ تھی کہ ان کا جیب خرچ بند کر دیا جاتا یا والد محترم کے ساتھ دسترخوان پر کھانا کھانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔اس پابندی کا جوش کی صحت پر برا اثر پڑنے لگا۔ایک دفعہ جوش بیہوش ہو گئے تو ان کے والد محترم نے انہیں شعر کہنے کی اجازت دیدی۔ جوشؔ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا انہوں نے بڑی اچھی غزلیں بھی کہی ہیں غزل کو ایک نیا رنگ وآہنگ سے روشناس کرانے کی کوشش کی۔نیا انداز پیدا کیا ان کی غزلیں قدیم غزلوں سے مختلف ضرور ہیں لیکن ان میں غزلیہ عناصر ضرور ہیں۔عشقیہ معاملات اور واردات و کیفیات کی ترجمانی اس میں موجود ہے ان سب کو جوشؔ نے ایک نئے زاویے سے پیش کیا ہے۔ان کی ابتدائی غزلیں بھی اس نقطۂ نظر کے لحاظ سے اہم سرمایہ ہیں۔

جوشؔ کو غزل کے میدان کے وسیع نہ ہونے سے شکایت تھی اسی بناء پر جلد ہی اس کوچہ کو چھوڑ کر نظم، مرثیہ اور رباعی کے میدان میں آ گئے۔ یہاں ہم اس کائی میں رباعی کے تعلق سے گفتگو کر رہے ہیں۔دراصل رباعی بھی دیگر اصنافِ سخن کی طرح اردو میں فارسی ہی کی دین ہے۔مزے دار بات یہ ہے کہ خود ہندوستان کے اندر بھی اسی سے ملتی جلتی ایک صنف سخن موجود ہے جسے سنسکرت زبان میں ''چار چرن'' اور ہندی زبان میں ''چوپائی'' کہا جاتا ہے۔پشتو زبان میں بھی غالباً اسی کے مشابہ ایک صنفِ سخن ہے جس کو ''چار بیتہ'' کہا جاتا ہے۔رباعی کے چوبیس اَوزان مقرر کیے گئے ہیں۔اکثر شعرا کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں اَوزان میں ہی رباعیاں کہیں۔اگرچہ بعض شعرا نے دوسرے اَوزان میں بھی رباعیاں کہی ہیں رباعی کے چار مصرعوں میں تین مصرعے ہم ردیف وقافیہ ہوتے ہیں۔عام طور پر رباعی گو شعرا پہلے چوتھا مصرع کہہ لیتے ہیں اور اس کے بعد رباعی کے باقی تین مصرعے کہتے ہیں۔

یوں تو فارسی شاعری میں کئی شعرا نے ایک بڑی تعداد میں رباعیاں کہی ہیں اور بعض تو ایسے ہیں جن کی شہرت کی بنیاد ہی رباعی گوئی پر ہے۔ایسے شاعروں میں خیام، سحابی اور سلطان ابوسعید ابوالخیر خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔اگرچہ اردو شاعری میں رباعی خاصی تعداد میں کہی گئی ہیں لیکن رباعی کو وہ اہمیت نہیں دی گئی جس کی وہ مستحق ہے۔چند کو چھوڑ کر باقی تمام اردو کے رباعی گو شعرا کی شہرت کی اصل بنیاد غزل، نظم، مثنوی یا مرثیہ پر ہے۔کچھ کا یہ بھی خیال ہے کہ انہوں نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے رباعیاں کہی تھیں۔شمالی ہندوستان میں خواجہ میر دردؔ، سوداؔ، میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ نے رباعی کے فن میں کمال حاصل کیا لیکن غزل کی غیر معمولی مقبولیت ہمیشہ اس صنفِ سخن کے راستے میں رخنہ ڈالے رہی۔ یہ امر بھی دل چسپ ہے کہ مرثیہ گو شعرا نے رباعی کے فروغ میں خاطر خواہ حصہ لیا۔مرثیہ گو شعرا مشاعروں میں پہلے ایک یا دو رباعیاں پڑھتے اس کے بعد ہی سلام اور مرثیہ وغیرہ پیش کرتے۔

مرثیوں کی طرح ہی رباعیوں کا مقابلہ ہوتا تھا۔اگر کوئی مرثیہ گوشاعر رباعی پڑھتا تو اس کا حریف بھی رباعی ہی پیش کرتا اور پہلے شاعر کی رباعی کے مفہوم کو بہتر انداز و آہنگ میں کہہ کر دکھانے کی کوشش کرتا۔اس طرح کی رباعیاں انیسؔ و دبیرؔ کے یہاں خاصی تعداد موجود ہیں جو ایک دوسرے کے تقابل میں کہی گئی تھیں۔یہ ایک مشکل امر ہے کہ یہ روایت (مرثیہ سے قبل رباعی کہنے کا طریقہ) انیسؔ و دبیرؔ کے زمانے میں شروع ہوا تھا یا اس سے قبل اس کی بنیاد پڑ چکی تھی۔

بیسویں صدی میں بھی اردو شاعروں نے بھی ایک بڑی تعداد میں رباعیاں کہیں۔ان میں جوش کی رباعیوں کے دو مجموعے ''جنون و حکمت'' اور ''نجوم و جواہر'' شائع ہوئے۔رگھوپتی سہائے فراق گورکھ پوری کی رباعیاں ''روپ'' کے نام سے اور جاں نثار اختر کی رباعیاں ''گھر آنگن'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ان کے علاوہ رباعی گوشعرا میں امجدؔ حیدرآبادی، جگت موہن لال رواںؔ، افقؔ لکھنوی، یگانہؔ چنگیزی، سیمابؔ اکبرآبادی اور فانیؔ بدایونی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔

اردو شاعری میں جوشؔ کی رباعیاں گراں قدر سرمایہ ہیں۔جب بھی اردو زبان میں رباعی گوئی کی تاریخ قلم بند کی جائے گی تو اس میں جوشؔ کا ذکر ضرور آئے گا اور انہیں رباعی گوئی کی تاریخ کے اوراق میں ممتاز حیثیت دی جائے گی۔کہیں کہیں جوشؔ اپنی شاعرانہ مصوّری، فکر و بصیرت، رومان پسندی اور زبان و بیان پر قدرت کی بنا پر دنیا کے مشہور رباعی گو شاعر عمر خیام کے ہم پلّہ نظر آتے ہیں۔جوشؔ کی رباعیات میں علامتی شاعری اور الفاظ کے اُتار چڑھاؤ اپنی معراج پر پہنچتی دکھائی دیتی ہے۔جوشؔ نے نہ صرف عمیق سے عمیق موضوعات کو نظم کیا بلکہ اس بلا کی علامت نگاری کے ساتھ پیش کیا کہ شاید ہی اس کی مثال اردو ادب میں مل سکے۔اسی علامت نگاری سے متعلق جوش کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

طاقِ جاں کا سراج بن جاتا ہے | فرقِ ہستی کا تاج بن جاتا ہے
تا وقتِ اجل ذہن پہ رہتا ہے سوار | وہ مسئلہ جو مزاج بن جاتا ہے

☆

دانا ہے تو وقتِ گُزراں کو پہچان | صدیوں کو اُٹھائے پھر رہی ہے ہر آن
چپ چاپ گزر رہے ہیں تاریخ بہ دوش | لمحوں کے لباس میں کروڑوں انسان

جوشؔ اگر چہ صوفی نہیں تھے مگر انہوں نے فارسی اور اردو شاعری کے ذریعے تصوف کے بنیادی فلسفوں کو سمجھا۔انہیں متصوّفانہ مضامین میں سے ایک مضمون انسانی عظمت کا احساس ہے۔یہ مضمون جوشؔ کے مزاج سے بہت مطابقت رکھتا تھا۔اسی لئے انہوں نے اپنی نظموں اور رباعیوں میں انسانی عظمت کے موضوع کو مختلف انداز میں پیش کیا ہے۔اسی موضوع سے متعلق ان کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

اُلٹے گا فلک نقاب، تیرے آگے | کُھل جائے گی ہر کتاب تیرے آگے
ہوجائے گا جب عارفِ یک ذرّہ خاک | جھُک جائے گا آفتاب تیرے آگے

☆

جب فکر نے راہ پر لگایا مجھ کو حکمت نے جب آئینہ دِکھایا مجھ کو
ذرّات سے لے کے تابہ انجم، واللہ جز اپنے کوئی نظر نہ آیا مجھ کو

☆

چھانی ہر چند اک خدائی ہم نے کیا کیا نہ یہاں خاک اُڑائی ہم نے
واللہ کہ خشکی و تَری میں کوئی شَے انساں سے عجیب تَر نہ پائی ہم نے

☆

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے ''مَیں'' نکلتا ہے ندیم! اِس پردے میں ''کائنات'' کہتا ہوں میں

تصوف کا یہ خاص فلسفہ ہے کہ کائنات کی ہر شے میں ذاتِ خداوند جلوہ گر ہے۔ اس مضمون کو جوشؔ کس خوب اسلوبی سے اپنے منفرد انداز میں پیش کیا ہے:

ہر نطق پر ایک گفتگو جاری ہے ہر خاک پہ ایک آب جُو جاری ہے
حیوان و نباتات و جماد و انساں ہر نبض میں ایک ہی لہو جاری ہے

☆

لاکھوں جسم، ایک جان، دیکھو تو ذرا سَو رُخ ہیں اور ایک شان، دیکھو تو ذرا
جن و بشر و اَہرمن و یزداں کا ہے ایک ہی خاندان، دیکھو تو ذرا

جوشؔ کا تعلق ایک دولت مند خاندان سے تھا۔ جوشؔ کے والد بہت خداپرست، نیک شریف اور مہذب انسان تھے۔ ان کی سرکار سے سیکڑوں بیواؤں، یتیموں اور ضعیفوں کو ماہانہ وظیفے ملا کرتے تھے۔ جوشؔ کو دادا اور اپنے والد سے وراثت میں دونوں خوبیاں اور خصوصیات ملی تھیں۔ جب تک جوشؔ کے پاس دولت رہی وہ بہت فیاض اور غریب نواز رہے اور ان کی زندگی عیش وعشرت میں گزری لیکن جب دولت ختم ہوگئی تو ان کی غریب نوازی کا اظہار ان کی شاعری میں نظر آنے لگا۔ ان کا تعلق جاگیردار خاندان سے تھا۔ ان کی پرورش بھی اسی ماحول میں ہوئی۔ جوشؔ نے اس ماحول میں غریبوں اور بیکسوں پر ظلم وستم ہوتے دیکھا تھا۔ اس لئے وہ جاگیردارانہ نظام کے سخت مخالف بن گئے تھے۔ ان کے اس ذہنی رویّہ کا اثر ان کی نظموں اور رباعی میں جابجا نظر آتا ہے۔ اسی موضوع سے متعلق جوشؔ کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

ہر صبح ہے شام، بے نَوا کے آگے ہر نغمہ ہے فریاد، گدا کے آگے
مفلس کا وہی حال ہے بندوں کے حضور مشرک کی جو حالت ہے خدا کے آگے

جوشؔ کا خیال ہے کہ اگر غریبی اور مفلسی مسلسل جاری رہے تو انسان تمام اخلاقی قدروں کو چھوڑ دیتا ہے۔ اعلیٰ ترین اخلاقی خوبیوں کا مالک انسان کی فطرت میں بھی ذلالت اور کمینگی آجاتی ہے۔ اگر غریبی ہے تو خدا کے قریب آنے لگتا ہے اور اگر یہ مسلسل ہوجائے تو خدا سے قریب آنا تو کیا انسان خدا کی ذات سے منکر ہوکر بھی کافر ہوجاتا ہے۔ ذیل کی رباعی ملاحظہ کیجیے:

ہر صاحبِ جوہر کو سُبک سَر کر دے فطرت کو زبوں کر کے زبوں تر کر دے
افلاس کہ کھینچتا ہے ایماں کی طرف کم بخت مسلسل ہو تو کافر کر دے

اگلی رباعی میں جوش غربت کا حال اس طرح پیش کرتے ہیں کہ اگر غریبی ہو تو صبح کی روشنی تاریکی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔غریبوں کی اپنے سماج کے لوگوں کے سامنے وہی کیفیت وحالت ہوتی ہے جو مشرک کی خدا کے سامنے ہوتی ہے یعنی جس طرح مشرک خدا کے سامنے اپنے گناہوں کے احساس سے شرمندہ وپشیمان ہوتا ہے اسی طرح ایک غریب دولت مندوں کے سامنے شرم سے نگاہیں جھکائیں رہتا ہے۔

جوشؔ کی یہ رباعی ملاحظہ کریں:

کچھ اِس کے نہیں خلاف ہونے والا مطلع یہ نہیں ہے صاف ہونے والا
ہاں مل کے رہے گی تنگ دستی کی سزا یہ جرم نہیں معاف ہونے والا

جوش غریبوں کی طاقت قوت سے بخوبی واقف ہیں۔وہ جانتے ہیں کہ اگر ایک دن غریب اپنی ہمت وحوصلہ کے بل بوتے پر ظالموں کے خلاف علَمِ بغاوت لے کر کھڑے ہو گئے تو وہ ضرور ظالموں کا صفایا کر کے دم لیں گے۔اور اگر انہیں دولت نصیب ہو جائے اور ان کے دماغ میں تخریب کا فتور آ جائے تو یہ آگ کے شعلے بلند کر دیں گے۔ایک قیامت کھڑی کر دیں گے۔پھر دنیا کو ایک نیا پیغام دے رہے ہوں گے۔

مذکورہ مفہوم کی نشان دہی کرتی ذیل میں یہ دو رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

ہر سانس کو وقفِ صد شرارت کر دیں اخلاق کی کچھ عجیب حالت کر دیں
مفلس کہ اَمیروں کے گِناتے ہیں گناہ دولت اِنہیں دے دو تو قیامت کر دیں

☆

خونیں چشمے اُبل رہے ہیں یارب! خنجر سینوں پہ چل رہے ہیں یارب!
تجھ کو بھی خبر ہے کہ تری دنیا میں چھوٹوں کو بڑے نگل رہے ہیں یارب!

جوشؔ نے اپنی رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی بہت رباعی کہی ہیں جوشؔ نے اردو شاعری کے کچھ روایتی موضوعات کو اپنا کر ایک منفرد انداز میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ان میں ایک طرح کی تازگی،جدّت،ندرت اور شگفتگی کی چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ یہ مضمون جوشؔ کی جدّتِ طبع کا نتیجہ ہیں۔اب بے ثباتیِ دنیا پر چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

افسوس کہ کوئی کام ہوتا ہی نہیں جی بھر کے یہاں قیام ہوتا ہی نہیں
سننے والے تمام ہو جاتے ہیں افسانہ مگر تمام ہوتا ہی نہیں

☆

ہر سانس میں قانونِ سزا جاری ہے ہستی نہیں، اک قسم کی بیماری ہے
انساں پہ یہ زندگی ہے اِک قہرِ خدا بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے

☆

غنچے! تیری زندگی پہ دل ہِلتا ہے — صرف ایک تبسم کے لئے کِھلتا ہے
غنچے نے کہا: ہنس کے چمن میں بابا! — یہ ایک تبسم بھی کسے مِلتا ہے؟

☆

کِھلتے ہی گلاب خار ہو جاتا ہے — ہنستے ہی بس اشک بار ہو جاتا ہے
پیدا ہوتے ہی تیرہ قسمت انساں — اے موت ! ترا شکار ہو جاتا ہے

☆

اِس بزمِ خیال میں ٹھہرنا بھی فریب — اِس راہِ توہّم سے گزرنا بھی فریب
واللہ کہ اِس منزلِ آب و ِگل میں — جینا بھی ہے اِک فریب، مَرنا بھی فریب

☆

پابندِ بقا رہا نہ کوئی اب تک — ہستی کی کوئی خیرمنائے کب تک؟
قائم رہتا ہے زندگانی کا نظام — انسان سے موت کھیلتی ہے جب تک

جوشؔ نے اپنی شاعری میں بہت سے ایسے اشعار کہے ہیں کہ جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوش نے بارگاہِ رب العزت میں گستاخانہ انداز اختیار کیا ہے۔بعض جگہ تو یہ گستاخی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ جوشؔ خدا کے وجود سے ہی انکاری ہیں حالاں کہ ان کے کلام میں ایسے اشعار اور رباعیات وافر مقدار میں موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ وہ دل سے خدا کے وجود کے قائل تھے لیکن خدا کی بارگاہ میں مخاطب ہوتے ہوئے ان کی لہجہ میں شوخی کا عنصر ضرور ہوتا تھا لیکن جوشؔ نے حضور اکرم کی شان میں گستاخی کبھی نہیں کی بلکہ آپ خدا اور سول، حضرت علی، حضرت امام حسین کا دل وجان سے احترام کرتے تھے۔جس کا ثبوت ان کے اشعار، رباعی اور مرثیوں میں موجود ہے۔جن کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دل سے خدا ورسول کے قائل ہیں۔انہیں تعلق سے ان کی چند رباعیاں ملاحظہ کیجیے:

اِس دہر کا بندوبست دیکھو گے اگر — شانِ فتح و شکست دیکھو گے اگر
ہوجائے گی سطحِ ذہن خود سے ہم وَار — دنیا کے بلند و پست دیکھو گے اگر

☆

اک آگ سی رہ رہ کے بھڑکتی ہے ضرور — سینے میں کلی سی اک چٹکتی ہے ضرور
واقف نہیں مَیں خدا سے لیکن اکثر — دل میں اک پھانس سی کھٹکتی ہے ضرور

☆

ہر شَر میں نہاں خیر کا جوہر دیکھا — ہر خار کے پردے میں گلِ تَر دیکھا
جب چاک کیا ذرّۂ تاریک کا دل — خورشیدِ اَزل کو جلوہ گُستر دیکھا

☆

یہ نارِ جہنم ، یہ سزا کچھ بھی نہیں
یہ دغدغۂ روزِ جزا ، کچھ بھی نہیں
اللہ کو قہار بتانے والو !
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

جوشؔ کا ایک اہم موضوع ''حسن وعشق'' بھی ہے۔ جوش کے منفرد اندازِ بیان نے ان رباعیات کو بہت ہی خوب صورت و دل کش بنا دیا ہے۔ جوشؔ نے حسن وعشق کے موضوع پر کافی رباعیاں کہی ہیں لیکن ہم یہاں ان کی چند رباعیاں ہی پیش کرتے ہیں۔ بغور ملاحظہ کیجیے:

افسوس یہ سِن ، یہ بدحواسی تیری
دل ہی نہیں، روح بھی ہے پیاسی تیری
ہنستی ہے تو منہ اُترنے لگتا ہے تِرا
کس درجہ مکمل ہے اُداسی تیری

☆

گھیرے رہو میرے غم گُسارو! مجھ کو
میں ڈوبنے والا ہوں ، اُبھارو مجھ کو
فرقت کی ابھی ہیں ابتدائی راتیں
خلوت میں نہ بیٹھنے دو یارو! مجھ کو

☆

دل سینۂ نازک میں مچل جاتا ہے
چشمہ تِری آنکھوں کا اُبل جاتا ہے
اللہ رے سوزِ غم کہ میرے آگے
پھُولوں کا تِرے رنگ بدل جاتا ہے

☆

کیا آج تعارف میں لجایا کوئی؟
کیا جانیے کیوں سنبھل نہ پایا کوئی
میں نے جو کہا ''جوشؔ مجھے کہتے ہیں''
آنکھوں کو جھکا کے مسکرایا کوئی

☆

بہلانے سے، دَم بھر نہ بہلتا ہوگا
دل حُسن کا چٹکیوں میں مَلتا ہوگا
اے نالۂ شب گیر ! خدارا تھم جا
بستر پہ وہ کروٹیں بدلتا ہوگا

☆

رگ رگ میں بسی ہے تیری خوشبو اب تک
واللہ تھمے نہیں ہیں آنسو اب تک
اے رشکِ چمن ! جدھر بٹھایا تھا تجھے
ویران ہے اُس دن سے وہ پہلو اب تک

☆

فریاد! رگوں سے دَم کھنچا جاتا ہے
دل ہجر میں بیٹھا ہی چلا جاتا ہے
چھٹنے ہی پہ نبضیں ہیں، اُکھڑنے ہی پہ سانس
اللہ ! یہ کیا جی کو ہوا جاتا ہے؟

اردو ادب میں کہی جانے والی بیش تر رباعیوں کا موضوع ہی شراب، عیش وعشرت اور دنیاوی لذت ہے۔ اردو ادب میں اکثر رباعی گو شعرا نے خمریات کے مضامین کو بہت زیادہ باندھا ہے۔ ایک بات تو یہ ہے کہ جوشؔ میں خود ہی مے نوشی کی عادت تھی اس لئے قرین قیاس تو یہی کہتا ہے کہ انھوں نے جام کے لطف لے لے کر شراب اور اس کے لوازمات کا بیان رباعی میں کیسے نہ کرتے۔

دیتا ہے کسے شیخ ! جہنم کی وَعید؟ ہے سینۂ شرک میں بھی قلبِ توحید
کھُل جائے اگر کاکُلِ ظُلمت کی گرہ ہر خُم سے برس پڑیں ہزاروں خورشید

☆

ہشیار کہ دل سے تاب وتب جاتی ہے آغوش سے لیلائے طرب جاتی ہے
ساقی غمِ صبح و فکرِ فردا تا کے؟ دینا ہے تو دے جام کہ شب جاتی ہے

☆

ساقی غمِ بیش و کم سے مَرتا کیوں ہے؟ مَیں رِندِ بلا نوش ہوں، ڈرتا کیوں ہے؟
تُو کون ومکاں کو رکھ دے شانے پہ مرے اور مَیں کہوں رکھ، مذاق کرتا کیوں ہے؟

☆

آئی ہے گھٹا مست بنائے گی ہمیں افلاک پہ جھُولے سے جھُلائے گی ہمیں
ساقی ! نہ رُکے ہاتھ کہ دم بھر میں یہ رُت ڈھونڈے گی بہت، مگر نہ پائے گی ہمیں

☆

ساقی مجھ کو رَواں دَواں جانا ہے اِس بزم سے کل کشاں کشاں جانا ہے
بہتر ہے کہ پہلے ہی سے جاتے رہیں ہوش جب یہ نہیں معلوم، کہاں جانا ہے؟

☆

پی جلد کہ کلیاں ہیں چٹکنے والی راہوں میں ہے بُوئے گُل بھٹکنے والی
ہُشیار! کہ مژگانِ جہاں سے تِری عمر آنسو کی طرح ہے اب ٹپکنے والی

☆

کیا شیخ ملے گا گُل فشانی کر کے؟ کیا پائے گا توہینِ جوانی کر کے؟
تو آتشِ دوزخ سے ڈراتا ہے اُنہیں جو آگ کو پی جاتے ہیں پانی کر کے؟

اردو شاعری میں جوشؔ کی رباعیاں گراں قدر سرمایہ ہیں۔ جوشؔ کی رباعیوں میں دنیا کی بے ثباتی، تصوف وفلسفہ، انسانی عظمت، غریبوں کی حالت اور حسن وعشق وغیرہ پر مبنی ہے۔ جب بھی اردو زبان میں رباعی گوئی کی تاریخ قلم بند کی جائے گی تو اس میں جوش کا ذکر ضرور آئے گا اور انہیں رباعی گوئی کی تاریخ کے اوراق میں ممتاز حیثیت دی جائے گی۔ شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کے نام کے بغیر اردو رباعی کی تاریخ ناقص و نامکمل رہے گی۔

09.05 رباعیات جوشؔ ''اقتباس''

﴿۱﴾

کر سعی کہ کام گار کر دوں گا تجھے　　کونین کا شہریار کر دوں گا تجھے
اک خس کا بھی راز جان لے گا جس وقت　　اللہ سے مَیں دوچار کر دوں گا تجھے

﴿۲﴾

کیا بات ہوئی کہ رو رہا ہے ناداں؟　　کیوں مفت میں جان کھو رہا ہے ناداں؟
نالاں ہے کہ سخت ہے زمانے کی گرفت　　یہ تجھ سے مذاق ہو رہا ہے ناداں؟

﴿۳﴾

جب حدِّ طلب سے دل نکل جاتا ہے　　سانچے میں طرب کے، درد ڈھل جاتا ہے
کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ نظریں　　ہر اشک، تبسم میں بدل جاتا ہے

﴿۴﴾

رقصاں ہو جو باطن میں جوانی ہے وُہی　　پیدا ہو جو خود سے ،کامرانی ہے وُہی
چشمے کی طرح دل سے جو تیرے پھوٹے　　اے یارِ عزیز ! شادمانی ہے وُہی

﴿۵﴾

مستی کا نشان ہے ، نہ سرشاری ہے　　انسان پر اک خوابِ گراں طاری ہے
اور اِس پہ یہ طُرَّہ کہ نہیں یہ بھی خبر　　خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری ہے

﴿۶﴾

تھا جانِ چمن جن کا ترانہ اک دن　　گُم ہوگیا اُن کا آشیانہ اک دن
کہتی ہے جسے آج ''حقیقت'' دنیا　　بن جائے گی یہ شَے بھی ''فسانہ'' اک دن

﴿۷﴾

تُجھ سے جو پھرے گی تو کدھر جائے گی؟　　لے جائے گا جس سمت، اُدھر جائے گی
دنیا کے حوادث سے نہ گھبرا کہ یہ عمر　　جس طرح گزارے گا، گزر جائے گی

﴿۸﴾

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے　　آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تُجھ کو　　اے شدّتِ غم پہ مسکرانے والے!

﴿۹﴾

ہر بات پہ منہ تِرا اُترتا کیوں ہے؟ جینے کے لئے بنا ہے، مَرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات! کونین خود اک کھیل ہے، ڈرتا کیوں ہے؟

﴿۱۰﴾

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا نرمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تِری جھک رہی ہیں مجھ سے مل کر دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

09.06 رباعیات جوشؔ ''تشریح''

کر سعی کہ کام گار کر دوں گا تجھے کونین کا شہریار کر دوں گا تجھے
اک خس کا بھی راز جان ے گا جس وقت ''اللہ'' سے مَیں دوچار کر دوں گا تجھے

اس رباعی میں شاعر یہ کہنے میں حق بجانب ہے کہ اگر کوئی بھی انسان کوشش ومحنت کرے گا تو اللہ رب العزت اس کو کامگار یعنی کامیاب وکامران کرے گا۔مصرعہ ثانی میں اس کومزید انعامات سے نوازنے کی بات کی گئی ہے کہ تجھ کودونوں جہاں کا بادشاہ بنادیا جائے گا اور اگر تو جس وقت تنکے کا راز جان لے گا تو یقیناً اللہ رب العزت کی بارگاہ سے تجھ کو شرفِ قبولیت سے نوازا جائے گا۔اور تیرے ایمان وایقان میں مزید نکھار پیدا ہوجائے گا۔رب کائنات کی بارگاہ سے تجھ کو رموز واسرار سے واقفیت ہوگی۔اس پوری رباعی میں ہمت وحوصلہ کا مثبت پیغام ہے۔عربی زبان کا ایک مقولہ ہے''مَن جَدَّ وَجَدَ'' جس نے کوشش کی اس نے پایا۔اس رباعی میں اسی کی ترجمانی ہے۔

کیا بات ہوئی کہ رو رہا ہے ناداں؟ کیوں مفت میں جان کھو رہا ہے ناداں؟
نالاں ہے کہ سخت ہے زمانے کی گرفت یہ تجھ سے مذاق ہو رہا ہے ناداں؟

شاعر کہتا ہے کہ کیا بات ہے جو یہ نادان روئے جارہا ہے۔اور مفت میں اپنی جان کو کھوئے جارہا ہے۔اور یہ زمانے کی سخت گرفت سے نالاں وپریشان ہوگیا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ یہ تیرے ساتھ مذاق ہورہا ہے تو اس سے دل برداشتہ مت ہو بلکہ یہ زمانہ یونہی اٹکھیلیاں کرتا رہتا ہے۔اس کے لئے ہمہ وقت تجھ کو تیار ومحتاط رہنا چاہیے۔

جب حدِّ طلب سے دل نکل جاتا ہے سانچے میں طرب کے، درد ڈھل جاتا ہے
کر لیتی ہیں غم کا جب احاطہ نظریں ہر اشک، تبسم میں بدل جاتا ہے

جب دل طلب کی حد سے باہر نکل جاتا ہے تو درد طرب یعنی خوشی کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور اس میں ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے کہ وہ درد بھی انسان کو سکون بخشنے لگتا ہے۔اور جب انسان کی نظریں غم کا احاطہ کرنے لگتی ہیں تو اس کا ہر ہر اشک تبسم کی شکل میں تبدیل ہوتا چلا جاتا ہے۔

رقصاں ہو جو باطن میں جوانی ہے وُہی پیدا ہو جو خود سے، کامرانی ہے وُہی
چشمے کی طرح دل سے جو تیرے پھوٹے اے یارِ عزیز! شادمانی ہے وُہی

شاعر نے مصرعہ اول میں جوانی کی یہ کیفیت بیان کی ہے کہ جوانی دراصل وہی جوانی ہے کہ جس میں باطن میں روح رقص کرتی ہوئی محسوس ہو جس سے بدن کے حصوں میں مچلنے جیسی کیفیت ہو۔ کامیابی وکامرانی وہی ہے جو خود سے پیدا ہو۔ اے میرے پیارے حقیقی خوشی وہی ہے کہ جس میں خوشیاں چشمہ کی طرح دل سے پھوٹے اور تیرے انگ انگ مسرت وشادمانی ظاہر ہو۔

مستی کا نشان ہے ، نہ سرشاری ہے انسان پر اک خوابِ گراں طاری ہے
اور اِس پہ یہ طُرّہ کہ نہیں یہ بھی خبر خود موت بھی خواب ہے کہ بیداری ہے

اس رباعی کے اندر انسانی زندگی کا فلسفہ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ اس میں نہ مستی جیسی کیفیت ہے اور نہ سرشاری جیسا لطف ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت انسان پر ایک ایسی گہری نیند طاری ہے کہ جس میں اس کو اپنی سُدھ بُدھ بھی نہیں ہے اور اس سونے پہ سہاگہ یہ کہ حضرت انسان یہ بھی نہیں جانتا کہ موت ہے کیا؟ آیا خواب ہے؟ یا بیداری ہے؟

تھا جانِ چمن جن کا ترانہ اک دن گُم ہوگیا اُن کا آشیانہ اک دن
کہتی ہے جسے آج ''حقیقت'' دنیا بن جائے گی یہ شَے بھی ''فسانہ'' اک دن

شاعر اس رباعی میں کہتا ہے کہ ایک وہ وقت تھا اور ایسے لوگ ہوا کرتے تھے کہ جن کے ترانے چمن کی جان ہوا کرتے تھے اور ایک آج کا وقت ہے کہ ان کے آشیانے (گھر) گم (معدوم) ہو گئے ہیں جب کہ شعر دوم میں شاعر کہتا ہے کہ دنیا جسے آج ''حقیقت'' کہتی ہے تو ایک ایسا وقت آئے گا کہ یہ شَے بھی ''فسانہ'' بن جائے گی۔

تُجھ سے جو پھرے گی تو کدھر جائے گی؟ لے جائے گا جس سمت، اُدھر جائے گی
دنیا کے حوادث سے نہ گھبرا کہ یہ عمر جس طرح گزارے گا، گزر جائے گی

اس رباعی کے اندر زندگانی کے فلسفے کو پیش کیا گیا ہے کہ یہ تیری ہی زندگی ہے اگر تجھ سے پھرے گی تو کدھر جائے گی اور یہ اُدھر ہی جائے گی جس سمت تم لے جاؤ گے۔ عمرِ رفتہ کو حوادثاتِ زمانہ سے گھبرانا نہیں چاہیے کیوں کہ عمر جیسے بھی گزارو گے یہ تو ہی گزر رہی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ جس طرح چاہے اپنی زندگی گزار سکتے ہیں۔

دنیا میں ہیں بے شمار آنے والے آتے ہی رہیں گے روز جانے والے
عرفانِ حیات ہو مبارک تُجھ کو اے شدّتِ غم پہ مسکرانے والے!

شاعر نے اس رباعی میں دنیا کے نشیب وفراز کو پیش کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دنیا میں بے شمار آنے والے آتے ہیں اور روز جانے والے چلے جاتے ہیں۔ مگر ان سب میں سب سے اہم شخص وہ ہے جو کہ شدّت غم ہونے کے باوجود بھی مسکراتا ہے اور اسی کو زندگی کا عرفان ووجدان مبارک ہو۔

ہر بات پہ منہ ترا اُترتا کیوں ہے؟ جینے کے لئے بنا ہے، مَرتا کیوں ہے؟
کونین کے ساتھ کھیل اے طفلِ حیات! کونین خود اک کھیل ہے، ڈرتا کیوں ہے؟

اس رباعی میں شاعر کہتا ہے کہ ہر بات پر تیرا منھ کیوں اُتر تا ہے جب کہ جینے کے لئے تیری پیدائش ہوئی دنیا میں کچھ کرنے کے لئے تجھ کو سنوارا گیا ہے مگر تو تو مرنے کے لئے تیار ہے؟ اب تو اس بات کو سمجھ لے کہ یہ زندگی ایک کھیل ہے اور جس طرح بچہ کھلونوں کے ساتھ کھیلتا ہے تو بھی اس طرح کھیل! کیوں کہ یہ دنیا خود ایک کھلونے کی طرح ہے اس لئے تجھ کو یہ کھیل کھیلنا چاہیے اور ڈرنا نہیں چاہیے۔

کاکل کھل کر بکھر رہی ہے گویا — نرمی سے ندی گزر رہی ہے گویا
آنکھیں تری جھک رہی ہیں مجھ سے مل کر — دیوار سے دھوپ اُتر رہی ہے گویا

شاعر نے اس رباعی میں جس واقعہ کی بنیاد رکھی ہے۔ وہ رباعی کا تیسرا مصرعہ ہے۔ شاعر کا محبوب اس کے سامنے آیا تو شرم وحجاب سے محبوب شاعر سے آنکھیں نہیں ملا سکا اور اس کی آنکھیں جھک گئیں شاعر کو محبوب کے آنکھیں جھکانے کا منظر اتنا حسین وجمیل لگا کہ شاعر نے اس حسین منظر کو تین مختلف تشبیہات کے ذریعے رباعی کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے میں بیان کر دیا۔ ان تینوں مصرعوں میں ''گویا'' کی ردیف اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ رباعی کا چوتھا مصرع عام طور پر اس کی جان ہوا کرتا ہے۔ اس اعتبار سے اس رباعی کا سب سے خوب صورت تو ''دیوار سے دھوپ اتر رہی ہے گویا'' ہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شاعر نے دیوار سے آہستہ آہستہ دھوپ اُترنے کے پُر کیف منظر کو بارہا دیکھا ہو اور اپنے ذہن میں اس دل فریب منظر کو تشبیہ کے طور پر محفوظ رکھ لیا ہو۔ تا کہ وہ ان تشبیہات کسی ایسے ہی حقیقی واقعہ منطبق کر سکے سو اس رباعی میں شاعر کا یہ خواب پورا ہو گیا۔

09.07 شبّیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی کی منتخب دیگر رباعیاں

﴿۱﴾

مَیں اور کائنات ، اے محرمِ راز! — مدّت سے اب ایک ہیں بہ فیضانِ گداز
لے کر جو مِرا نام پکارا کوئی — آفاق سے لبیک کی آئی آواز

﴿۲﴾

انسان ازل سے ہے جہول اور ظلوم — لے دے کے ہے بس ایک شعورِ موہوم
طفلِ ناداں ہے ، آئینے کے آگے — کس کا یہ عکس ہے ، اِسے کیا معلوم؟

﴿۳﴾

یہ دغدغۂ گردشِ ایّام ہے کیا؟ — یہ بندِ گرانِ سحر و شام ہے کیا؟
اِس کی بھی خبر نہیں کہ آغاز ہے کیوں؟ — یہ بھی نہیں معلوم کہ انجام ہے کیا؟

﴿۴﴾

ہشیار اے آگہی کے طالب انسان! — دریائے حواس ، مکر کا ہے طوفان
خلاّقیِ وہم کے نہاں خانے کا — مالِ مسروقہ بیچتا ہے وجدان

﴿۵﴾

کم زور ہے مستحقِ دار و زِنداں
شہ زور ہے شایانِ سریر و ایواں
اک کوچہ اُڑا لو تو ذلیل و سارق
کُل شہر چُرا لو تو عزیز و خاقاں

﴿۶﴾

نکلی لبِ گُل سے ''آہ'' خوشبو بن کر
سَر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سَر سے گئی دل میں اُن کی تصویر لیے
تصویر ٹپکنے لگی آنسو بن کر

﴿۷﴾

ہاں خونِ جگر حنا نہ بننے پائے
اشکِ حسرت غذا نہ بننے پائے
بے شک مرضِ غم بھی ہو گا ہے گا ہے
لیکن یہ مرض دَوا نہ بننے پائے

﴿۸﴾

خود بین و خود آگاہ کیا ہے کس نے؟
ایمان کا بدخواہ کیا ہے کس نے؟
انسان کو شیطاں نے کیا ہے گُم راہ
شیطان کو گُم راہ کیا ہے کس نے؟

﴿۹﴾

جو لوگ عقائد سے غذا پاتے ہیں
یوں عقل کی آواز سے گھبراتے ہیں
جس طرح بہاراں کی ہوا چلتے ہی
بیمار لحافوں میں دُبک جاتے ہیں

﴿۱۰﴾

ناگن بَن کر مجھے نہ ڈسنا بادل
باراں کی کسوٹی پہ نی کسنا بادل
وہ پہلے پہل جدا ہوئے ہیں مجھ سے
اِس دیس میں اب کی، نہ برسنا بادل

﴿۱۱﴾

پھر دل میں خوشی کا راج دیکھا مَیں نے
پھر فرقِ جنوں پہ تاج دیکھا مَیں نے
پلٹے جو سفر سے تم تو اک عمر کے بعد
اپنی جانب پھر آج دیکھا مَیں نے

﴿۱۲﴾

گردن میں مِری پڑیں نہ باہیں تیری
ہونٹوں سے نکل سکیں نہ آہیں تیری
واللہ کہ اب مجھ پہ جہنم ہے حرام
ہنگامِ سفر ہائے نگاہیں تیری

﴿۱۳﴾

جانے والے قمر کو روکے کوئی
شب کے پیکِ سفر کو روکے کوئی
تھک کر مِرے زانو پہ وہ سویا ہے ابھی
روکے ، روکے ، سحر کو روکے کوئی

﴿۱۴﴾

اے حُسن ٹھہر! آگ بھڑک جائے گی
صہبا تری صاغر سے چھلک جائے گی
مجھ کو تو یہ ڈر ہے کہ دِلائی کیسی
اَنگڑائی جو لی ، مسک جائے گی

﴿۱۵﴾

کل رات گئے مست تھی جب موجِ نسیم
شبنم میں نہا رہی تھی پھولوں کی نسیم
اک حور نے ساغر سے نکل کر یہ کہا
مَیں رُوحِ مئے ہوش رُبا ہوں، تسلیم!

﴿۱۶﴾

کعبے سے ، کبھی دَیر سے یاری دیکھی
بُت کی تو کبھی خدا کی باری دیکھی
مطلوب کو اک نفس کا دھوکا پایا
دیکھی تو طلب میں پائیداری دیکھی

﴿۱۷﴾

ارمان ہے وہ دھوپ کی ڈھلتی ہی نہیں
حسرت وہ شَے ہے جو نکلتی ہی نہیں
مطلوب تو ہر روز بدل جاتے ہیں
کم بخت طلب ہے کہ بدلتی ہی نہیں

﴿۱۸﴾

میداں میں برستا ہوا پانی تا دُور
آڑی ترچھی ہوائیں مست و مخمور
اِس بارشِ کیف میں مبارک اے جوشؔ!
یہ کیف شرابور ، یہ مستی بھرپور

﴿۱۹﴾

رندانِ خرابات نشیں کی آواز
واللہ کہ ہے عرشِ بریں کی آواز
صہبا میں ہیں بحرِ معرفت کی موجیں
قلقل میں ہے جبریلِ اَمیں کی آواز

﴿۲۰﴾

اُس سانولی مطربہ کی اللہ رے آن
گُھل جاتی ہے چہرے کے نمک میں ہر تان
یوں نغمہ دمک اُٹھتا ہے اُس کے رُخ پر
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی پہ نشاں

09.08 خلاصہ

آپ کا پورا نام شبیر حسن خاں اور جوشؔ تخلص ہے۔ آپ کی تاریخ پیدائش میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اردو ادب میں جوش ملیح آبادی کی حیثیت نظم گو شاعر کی بھی ہے لیکن یہاں اس اکائی میں رباعی گو شاعر کی حیثیت سے جوش پر بات کی گئی ہے۔ جوشؔ کی بیش تر رباعیاں فکر انگیز اور بصیرت افروز ہیں اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں۔ زبان پر جوشؔ کی غیر معمولی قدرت نے ان رباعیوں کو بہت خوب صورت اور دل آویز بنا دیا ہے۔ جوشؔ کی رباعیوں کو اردو شاعری میں ایک اہم اضافہ سمجھا جاتا ہے۔ جوشؔ کی رباعیوں کے دو مجموعے شائع

ہوئے ہیں ایک کا نام ''جنون وحکمت'' اور دوسرے کا نام ''نجوم و جواہر'' ہے۔ آپ نے اس اکائی میں ان کے حالاتِ زندگی اور ان کی دس رباعیوں کا مطالعہ کیا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ آپ اس اکائی کے مطالعے کے بعد جوشؔ کے تعلق سے آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوا ہوگا۔ بہرحال رباعی کی تاریخ میں جوشؔ ملیح آبادی کے سرمائے نے ان کو زندہ وجاوید کر دیا ہے۔

09.09 فرہنگ

آب جو	ندی، نالہ	قاصر	کوتاہی
آفاق	اُفق کی جمع، آسمان کا کنارہ	قلم بند	تحریر کرنا، لکھنا
آہنگ	آواز	کاکُل	مرد کے بالوں کی لَٹ
اہرمن	آتش پرستوں کا برائی کا خدا	کامگار	کامیاب
بدحواسی	بری حالت، بے اوسانی	کائنات	دنیا
بے ثباتی	ناپائیداری	کشاکش	کھینچا تانی
جہول	بڑا نادان	کونین	دنیا
خَس	تنکا، ذرّہ، گھاس	گراں قدر	بلند قدر، بالا
خُم	مٹکا، شراب کا برتن	مالِ مسروقہ	چُوری کیا ہوا مال
دغدغہ	کھٹکا، ڈر	مژگان	پلک
ذرّات	ذرّہ کی جمع، تنکا	مدّاح	تعریف کرنے والا
رباعیاں	رباعی کی جمع	معراج	بلندی
رُت	موسم	منفرد	الگ
زمانی ترتیب	زمانے کے اعتبار سے	نطق	گویائی، بات
سراج	چراغ	وراثت	میراث پانا
سرمایہ	پونجی، مال	وسعت	کشادگی
سریر	تخت	وعید	دھمکی، عذاب کا وعدہ
شہریار	بادشاہ	ویران	اُوجڑ، غیر آباد
طُرّہ	پھندنا، کلغی، مزید	ہجر	جدائی
عمیق	گہری	ہم پلّہ	برابر

09.10 سوالات

مختصر سوالات

سوال نمبرا جوشؔ کی ابتدائی زندگی کے بارے میں بتایئے؟

سوال نمبر۲ جوشؔ کی رباعیوں کے اہم موضوعات پر اپنی آراء کا اظہار کیجیے؟

سوال نمبر۳ جوشؔ کی دو رباعیاں پیش کرتے ہوئے ان کا مفہوم بھی واضح کیجیے؟

تفصیلی سوالات

سوال نمبرا جوشؔ کی رباعیوں کی اہم خصوصیات مع امثلہ بیان کیجیے؟

سوال نمبر۲ جوشؔ کی رباعیوں میں خمریات کے عناصر کی نشان دہی کیجیے؟

سوال نمبر۳ جوشؔ ملیح آبادی کی زندگی پر ایک تفصیلی مضمون سپرد قرطاس کیجیے۔

معروضی سوالات

سوال نمبرا : جوشؔ ملیح آبادی کی پیدائش کہاں ہوئی؟

(الف) ملیح آباد میں (ب) لکھنؤ میں (ج) کلکتہ میں (د) بنارس میں

سوال نمبر۲ : جوشؔ ملیح آبادی کی پیدائش کب ہوئی؟

(الف) ۱۸۹۷ء میں (ب) ۱۸۹۶ء میں (ج) ۱۸۹۸ء میں (د) ۱۸۹۹ء میں

سوال نمبر۳ : جوشؔ ملیح آبادی کی وفات کہاں ہوئی؟

(الف) ناسک میں (ب) اسلام آباد میں (ج) دہلی میں (د) لکھنؤ میں

سوال نمبر۴ : جوشؔ ملیح آبادی کی وفات کب ہوئی؟

(الف) ۱۹۸۷ء میں (ب) ۱۹۹۶ء میں (ج) ۱۹۹۸ء میں (د) ۱۹۸۲ء میں

سوال نمبر۵ : جوشؔ ملیح آبادی کا اصل نام کیا تھا؟

(الف) عبادت حسین (ب) بشارت حسین (ج) بشیر احمد (د) شبیر حسن خاں

سوال نمبر۶ : ''جنون وحکمت'' اور ''نجوم وجواہر'' کس کی رباعیوں کے مجموعے ہیں؟

(الف) جوشؔ ملیح آبادی کی (ب) فراقؔ گورکھپوری کی (ج) امجدؔ حیدرآبادی کی (د) میر انیسؔ کی

سوال نمبر۷ : ''رموز'' کس لفظ کی جمع ہے؟

(الف) رمزیت کی (ب) رمز کی (ج) رمیز کی (د) مزامیر کی

سوال نمبر۸ : ''اَسرار'' کا معنٰی کیا ہے؟

(الف) اچھی باتیں (ب) بے کار باتیں (ج) راز کی باتیں (د) بے ہودہ باتیں

سوال نمبر۹ : ''افسانہ'' کا متضاد لفظ کیا ہے؟

(الف) کوئی نہیں (ب) دونوں (ج) خواب (د) حقیقت

سوال نمبر۱۰ : ''زندگی'' کا مترادف لفظ کیا ہے؟

(الف) حیات (ب) موت (ج) بندگی (د) رندگی

معروضی سوالات کے جوابات

جواب نمبر۱ : (الف) ملیح آباد میں

جواب نمبر۲ : (ج) ۱۸۹۸ء میں

جواب نمبر۳ : (ب) اسلام آباد میں

جواب نمبر۴ : (د) ۱۹۸۲ء میں

جواب نمبر۵ : (د) شبیر حسن خاں

جواب نمبر۶ : (الف) جوش ملیح آبادی کی

جواب نمبر۷ : (ب) رمزکی

جواب نمبر۸ : (ج) رازکی باتیں

جواب نمبر۹ : (د) حقیقت

جواب نمبر۱۰ : (الف) حیات

09.11 حوالہ جاتی کتب

۱۔ یادوں کی برات از جوش ملیح آبادی

۲۔ جوش ملیح آبادی خصوصی مطالعہ از ڈاکٹر قمر رئیس

۳۔ جنون وحکمت از جوش ملیح آبادی

✵

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی، ہلدوانی (نینی تال)

SCHOOL OF HUMANITIES

UTTARAKHAND OPEN UNIVERSITY

Teenpani Bypass Road, Behind Transport Nagar

Haldwani - 263 139, Nainital (Uttrakhand)

Phone: 05946-261122, 261123 Fax No.: 05946-264232

www.uou.ac.in   email: info@uou.ac.in

Toll Free No: 1800 180 4025

https://www.youtube.com/@91.2fmhellohaldwani7

اُتراکھنڈ اوپن یونی ورسٹی کا عوامی ریڈیو جس کے ذریعہ طلبا کے لئے مفید پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

https://www.youtube.com/@uoulive

MAUL - 608-1(004246)